معاصر اُردو افسانے میں استحصال حقوق اطفال کی پیش کش کا تجزیاتی مطالعہ

مقالہ برائے ایم فل (اُردو)

مقالہ نگار

عابدہ نذیر

فیکلٹی آف لینگویجز

نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد

جون ۲۰۲۵ء

معاصر اُردو افسانے میں استحصال حقوق اطفال کی پیش کش کا تجزیاتی مطالعہ

مقالہ نگار

عابدہ نذیر

یہ مقالہ

ایم فل (اُردو)

کی ڈگری کی جزوی تکمیل کے لیے پیش کیا گیا

فیکلٹی آف لینگویجز

(اُردو زبان و ادب)

نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد

جون ۲۰۲۵ء

مقالے کا دفاع اور منظوری کا فارم

زیرِ دستخطی تصدیق کرتے ہیں کہ انھوں نے مندرجہ ذیل مقالہ پڑھا اور مقالے کے دفاع کو جانچا ہے۔ وہ مجموعی طور پر مقالہ نگار کی کارکردگی سے مطمئن ہیں اور فیکلٹی آف لینگویجز کو اس مقالے کی منظوری کی سفارش کرتے ہیں۔

مقالہ بہ عنوان: معاصر اُردو افسانے میں استحصال حقوق اطفال کی پیش کش کا تجزیاتی مطالعہ

پیش کار: عابدہ نذیر

رجسٹریشن نمبر: 49MPhil/Urdu/S22

ماسٹر آف فلاسفی

شعبہ: شعبۂ اُردو زبان و ادب

ڈاکٹر صائمہ نذیر _____

نگران مقالہ

پروفیسر ڈاکٹر جمیل اصغر جامی _____

ڈین فیکلٹی آف لینگویجز

تاریخ : _____

اقرار نامہ

میں عابدہ نذیر اقرار کرتی ہوں کہ مقالہ ہذا بہ عنوان "معاصر اُردو افسانے میں استحصال حقوق اطفال کی پیش کش کا تجزیاتی مطالعہ "میرا ذاتی کام ہے۔ نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد کے ایم فل سکالر کی حیثیت سے ڈاکٹر صائمہ نذیر کی زیر نگرانی کیا گیا ہے۔ میں نے یہ کام اس سے پہلے کسی اور یونیورسٹی یا ادارے میں حصول سند کے لیے پیش نہیں کیا ہے اور نہ ہی آئندہ کروں گی۔

عابدہ نذیر

مقالہ نگار

فہرست

عنوان	صفحہ نمبر
مقالے کے دفاع اور منظوری کا فارم	ii
اقرار نامہ	iii
فہرست ابواب	iv
Abstract	vii
اظہارِ تشکر	viii
باب اول: موضوع کا تعارف اور بنیادی مباحث	۱
الف: تمہید	۱
۱۔ موضوع کا تعارف	۱
۲۔ بیان مسئلہ	۲
۳۔ مقاصد تحقیق	۳
۴۔ تحقیقی سوالات	۳
۵۔ قنظری دائرہ کار	۳
۶۔ تحقیقی طریقہ کار	۴
۷۔ مجوزہ موضوع پر ما قبل تحقیق	۵
۸۔ تحدید	۵
۹۔ پس منظری مطالعہ	۵
۱۰۔ تحقیق کی اہمیت	۷
ب۔ بنیادی مباحث: استحصال کی صورتیں	۸
ذہنی وجسمانی استحصال	۸
تعلیمی استحصال	۱۱

چائلڈ لیبر / معاشی استحصال ۱۳
جنسی استحصال ۱۶
ج۔ اقوام متحدہ کا انسانی حقوق کے چارٹر اور آئین پاکستان میں استحصال حقوق اطفال کا بیانیہ ۱۹
بچوں کے ذہنی و جسمانی استحصال سے متعلق نکات ۱۹
بچوں کا معاشی استحصال اور جبری مشقت ۲۳
بچوں کا تعلیمی استحصال ۲۵
بچوں کے جنسی استحصال سے متعلق نکات ۲۷
☆ حوالہ جات ۳۰
باب دوم: معاصر اُردو افسانے میں بچوں کے ذہنی و جسمانی استحصال کی پیشکش ۳۱
۱۔ معاصر اُردو افسانے میں بچوں کے ذہنی و جسمانی استحصال کے محرکات ۳۱
۲۔ معاصر اُردو افسانے میں بچوں کے ذہنی و جسمانی استحصال کی صورتیں ۴۵
☆ حوالہ جات ۶۰
باب سوم: معاصر اُردو افسانے میں بچوں کے تعلیمی و معاشی استحصال (چائلڈ لیبر) کی پیشکش ۶۲
۱۔ معاصر اُردو افسانے میں بچوں کے تعلیمی و معاشی استحصال کے محرکات ۶۵
۲۔ معاصر اُردو افسانے میں بچوں کے تعلیمی و معاشی استحصال کی صورتیں ۷۶
☆ حوالہ جات ۸۹
باب چہارم: معاصر اُردو افسانے میں بچوں کے جنسی استحصال کی پیشکش ۹۱
۱۔ معاصر اُردو افسانے میں بچوں کے جنسی استحصال کے محرکات ۹۲
۲۔ معاصر اُردو افسانے میں بچوں کے جنسی استحصال کی صورتیں ۱۰۳
☆ حوالہ جات ۱۱۶
باب پنجم: مجموعی جائزہ ۱۱۷
ماحصل ۱۱۷

تحقیقی نتائج ۱۲۵
سفارشات ۱۲۷
کتابیات ۱۲۸

ABSTRACT

Title: An Analytical Study of Exploitation of Children's Rights Presented in Contemperory Urdu Short Stories

This study is about how contemporary Urdu short stories highlight the fact about exploitation of children's rights. Through literature's analysis, the research targets to highlight the social, emotional, and psychological impact of such violations and victimizations as described in fiction.

Exploitation's theme frequently comes in Urdu literature and is evident in the writings of various authors.

It has been described in every era through different literary styles. Sadly, the fact and reality remains that in all over the history, the vulnerable have often been mistreated by the powerful across the world. By keeping in mind that perspective, the topic of discussion would be related to child exploitation and rights of children in the selected Urdu Short Stories.

We can found various topics in Urdu Literature related to child victimization. This study will emphasize children's rights as enumerated in the United Nations Charter of Human Rights and their reflection in Pakistani law. Through Urdu Literature I will specify that how selected writers presented this oppression in their short stories. As according to new and modern era, the causes and forms of exploitation has also changed. In these selected short stories, writers have illustrated the latest conditions and elements of child abuse. Following four key factors are primarily emphasized;

Introduction of research and basic elements Depiction of Children's Mental and Physical Abuse in the Contemporary Era Educational Deprivation and Financial Exploitation through Child Labor Representation of Physical Violence against Children. This study analytically studies the representation of children's rights violations such as abuse, exploitation, and child labor in contemporary Urdu short stories.

اظہار تشکر

سب سے پہلے میں رب تعالیٰ کا شکر ادا کرتی ہوں کہ جس کے فضل و کرم اور عنایت سے مجھے اس تحقیقی مقالہ مکمل کرنے کی توفیق ہوئی ہے۔ میں اپنی قابل صد احترام نگران ڈاکٹر صائمہ نذیر کی بے حد مشکور ہوں جنھوں نے تحقیقی سفر کے ہر مرحلے میں میری رہنمائی کی، حوصلہ افزائی کی اور اپنی قیمتی آرا سے میرے کام بہتر بنانے میں ہمیشہ مدد گار رہیں۔ ان کی علمی بصیرت اور شفقت میرے لیے مشعل راہ بنی رہی۔

میں اپنے محترم والدین کی بہت شکر گزار ہوں جن کے توسط سے مجھے آگے بڑھنے کا حوصلہ ملا اور علم حاصل کرنے کی راہیں ہموار ہوئیں۔ محترم ڈاکٹر عابد سیال اور شعبۂ اردو نمل کے تمام اساتذہ کرام کی بھی تہ دل سے مشکور ہوں جنھوں نے میرے علم میں اضافہ کیا اور مجھے اس قابل بنایا کہ میں تحقیقی عمل کو بہتر انداز میں سرانجام دے سکوں۔

یہ مقالہ ایک علمی کوشش ہے۔ میں نے اپنی محدود صلاحیتوں اور دستیاب وسائل کے ساتھ اسے بہتر بنانے کی کوشش کی ہے۔

عابدہ نذیر

باب اول:

موضوع کا تعارف اور بنیادی مباحث

الف) تمہید

ا۔ موضوع کا تعارف (INTRODUCTION)

استحصال کا موضوع اُردو افسانے کے حوالے سے کوئی نیا موضوع نہیں ہے۔ اس حوالے سے ہمارے ادیب ہر عہد میں لکھتے آئے ہیں۔ انسان ہمیشہ سے اپنے سے طاقت ور کے ہاتھوں کسی نہ کسی صورت میں استحصال کا شکار بھی رہا ہے۔ اس عنوان کے تحت معاصر پاکستانی منتخب اُردو افسانوں میں استحصال حقوق اطفال کو موضوع بنایا گیا۔ جدید عہد میں مختلف ادارے اور تنظیمیں جہاں انسانی حقوق کی پاسداری کے لیے کار فرما رہیں وہیں ان اداروں نے لوگوں میں اپنے حقوق کے تحفظ کے لیے شعور اُجاگر کرنے میں بھی اہم کردار ادا کیا ہے۔ اُردو ادب اور بالخصوص اُردو افسانے میں استحصال کی مختلف صورتوں کو موضوع بنایا گیا ہے۔ ادیب اپنے عہد کے اہم مسائل پر ہمیشہ سے لکھتے آئے ہیں۔ جدید عہد میں ادب کے موضوعاتی کینوس میں وسعت آئی ہے وہیں مسائل نے بھی نیا رخ اختیار کیا ہے۔ معاشرتی مسائل میں حقوق کی پامالی ایک سنگین مسئلے کی صورت میں ہمیشہ سے موجود ہے۔ ہمارے ادیب نے ہر عہد میں اس مسئلے کی طرف توجہ دلانے کی کوشش کی ہے۔ زیرِ نظر موضوع کے تحت منتخب پاکستانی افسانہ نگاروں کے فن پاروں کا مطالعہ کرتے ہوئے بچوں کے ساتھ روا رکھے جانے والے استحصالی رویوں اور ان کے محرکات کی پیشکش کا جائزہ لیا گیا۔ اقوام متحدہ کے انسانی حقوق کے چارٹر اور آئین پاکستان میں حقوق اطفال کے بیانیے کو مد نظر رکھتے ہوئے اس سے متعلقہ بنیادی نکات کا جائزہ لیا گیا اور اس بات کا تجزیہ پیش کیا کہ منتخب افسانہ نگاروں نے ان مسائل کی پیش کش کیسے کی ہے۔

ادب معاشرتی زندگی کا عکاس ہے۔ ایک حساس تخلیق کار جب معاشرے میں رونما ہونے والی ناانصافیوں کا مشاہدہ کرتا ہے تو وہ ان استحصالی رویوں کو زیر بحث لاتا ہے اور پھر قلم کی طاقت کو استعمال میں لاتے ہوئے اپنی تحریروں کے ذریعے عوامی شعور اجاگر کرنے کی کوشش کرتا ہے تاکہ عوام سماج میں موجود مسائل کو جان سکیں اور ان مسائل پر حتی الامکان قابو پایا جاسکے۔

اس مقالے میں ترجیحی بنیادوں پر استحصال حقوق اطفال سے متعلقہ موضوعات شامل ہیں۔ معاشرے میں یہ استحصالی مسائل اور استحصالی رویے موجود ہیں اور ان مسائل کی شرح آئے روز بڑھتی جارہی ہے۔ بچے کسی بھی معاشرے کی خوشحالی کے ضامن ہوتے ہیں بشرط یہ کہ ان کی ذہنی اور جسمانی حالت مثالی انداز میں پروان چڑھائی جائے۔

جدید معاشرے میں جہاں ہر حوالے سے جدت دیکھنے کو ملتی ہے۔ استحصال کی بھی نئی نئی صورتیں سامنے آتی ہیں۔ اُردو افسانے میں بچوں کا استحصال مختلف صورتوں کے بیان کو ہمارے ادیب نے پہلے سے موجود مسائل کے ساتھ ساتھ ان مسائل کو بھی پیش کیا ہے جن کا تعلق خاص طور پر نئے عہد سے ہے جو بظاہر ترقی یافتہ عہد ہے لیکن مسائل کی نوعیت مختلف صورت میں سامنے آتی ہے۔ ادب میں بھی اس کا بیانیہ تمام تر سنگینیوں کے ساتھ موجود ہے۔ بہت سے ادبی فن پاروں میں ان مسائل کی نشاندہی کی گئی ہے جن کو اس مقالے میں منظرِ عام پر لانے کی ہر ممکن کوشش کی گئی۔ مجوزہ تحقیقی مقالے میں بچوں کے ساتھ استحصالی رّویوں کے پیچھے کار فرما عوامل اور بچوں کے ساتھ روا رکھے جانے والے استحصالی روّیوں کی مختلف صورتوں اور اُردو افسانے میں اس کی پیش کش کا جائزہ لیا گیا۔

زیر نظر موضوع کے تحت معاصر اُردو افسانے کا مطالعہ کر کے تین افسانہ نگاروں کا انتخاب کیا گیا ہے جن کے افسانے اس موضوع سے مطابقت رکھتے ہیں۔ ان افسانوں کی تعداد چودہ ہے۔

۲۔ بیانِ مسئلہ (THESIS STATEMENT)

استحصال حقوق اطفال ایک حساس مسئلہ ہے اور براہ راست انسانی معاشرے سے تعلق رکھتا ہے۔ اس سنجیدہ مسئلے سے متعلق عوامی آگاہی کے لیے ہر سطح پر ممکنہ اقدامات کیے جارہے ہیں جس میں سوشل میڈیا، بین الاقوامی میڈیا، ٹی وی ڈرامے، فلمیں، ڈاکومنٹریز، مضامین، آرٹیکلز، کالمز اور وی لاگز وغیرہ شامل ہیں۔ اُردو ادب میں بھی اس مسئلے کو موضوع بحث بنایا گیا ہے اور اُردو ادب میں اس موضوع پر بہت سے ادیبوں نے قلم اٹھایا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس موضوع پر تحقیقی کام کرتے ہوئے ان کی کاوشوں کو سامنے لانے کی ضرورت ہے۔ اس سلسلے میں افسانے کی صنف کا انتخاب کیا گیا ہے۔ اس تحقیقی مقالے میں بچوں کے ساتھ استحصال کی مختلف صورتوں، ان کے محرکات کو بیان کرنے کی کوشش کی گئی اور معاصر اُردو افسانے میں استحصال حقوق

اطفال کی پیشکش کا جائزہ لیا گیا ہے۔ یوں تو استحصال حقوق کے حوالے سے مختلف سطحوں پر تحقیقی و تنقیدی کام ہوا ہے، ہو بھی رہا ہے جن میں انسانی حقوق اور حقوق نسواں اہم موضوعات ہیں۔ لیکن استحصال حقوق اطفال کے حوالے سے خصوصی طور پر کوئی واضح کام منظرِ عام پر نہیں آیا۔ یہی وجہ ہے کہ یہ موضوع تقاضا کرتا ہے کہ اس موضوع پر جامعاتی سطح پر تحقیقی کام کیا جائے۔

۳۔ مقاصدِ تحقیق (RESEARCH OBJECTIVES)

مجوزہ تحقیقی مقالہ کے مقاصد درجِ ذیل ہیں:

۱۔ معاصر اُردو افسانے میں استحصال حقوق اطفال کی صورتوں کا مطالعہ کیا گیا ہے۔

۲۔ معاصر پاکستانی اُردو افسانے میں استحصال حقوق اطفال کی پیش کش کا جائزہ لیا گیا ہے۔

۳۔ معاصر اُردو افسانے میں استحصال حقوق اطفال کے محرکات کا تجزیہ کیا گیا ہے۔

۴۔ تحقیقی سوالات (RESEARCH QUESTIONS)

زیرِ نظر تحقیقی مقالے کے لیے درج ذیل سوالات کو مد نظر رکھا گیا ہے:

۱۔ معاصر اُردو افسانے میں استحصال حقوق اطفال کی کون کون سی صورتیں بیان کی گئی ہیں؟

۲۔ معاصر اُردو افسانے میں استحصال حقوق اطفال کی پیش کش کی نوعیت کیا ہے؟

۳۔ معاصر اُردو افسانے میں استحصال حقوق اطفال کے محرکات کیا ہیں؟

۵۔ نظری دائرہ کار (Theoretical Framework)

زیرِ نظر تحقیقی مقالے میں بچوں کے استحصال کی پیش کش کے موضوع پر تحقیقی کام کیا گیا ہے۔ اس حوالے سے افسانہ کی صنف کا انتخاب کیا گیا ہے۔ اس سلسلے میں اب تک جن افسانہ نگاروں کا انتخاب کیا گیا ہے ان میں شعیب خالق، حمزہ حسن شیخ اور مریم مجید ڈار شامل ہیں۔ افسانہ نگاروں کے انتخاب کی وجہ یہ ہے کہ ان افسانہ نگاروں نے ان موضوعات پر افسانے تحریر کئے ہیں۔

معاشرے میں تبدیلی کے ساتھ ساتھ استحصال کی صورتیں بھی بدلتی جا رہی ہیں۔ جیسا کہ کم سنی کی شادی (Child Mariages)، جسمانی تشدد (Physical Abuse)، ذہنی یا نفسیاتی

دباؤ (Mental Abuse) زیادہ نمبر حاصل کرنے کے لئے والدین اور اساتذہ کے مابین مسابقت کا رجحان(Competition Tendency) یا پھر تعلیمی اداروں میں بچوں کے ساتھ پیش آنے والی بدمعاشی، غنڈہ گردی یا تعلیم حاصل کرنے کی عمر میں جبری مشقت(Forced Child labour) ، وغیرہ جیسے کئی مسائل ہیں جو کہ موجودہ معاشرے کے ساتھ روزانہ کی بنیادوں پر پیش آتے ہیں اور کئی لوگ بلواسطہ یابلاواسطہ ان سے متاثر ہوتے ہیں۔ اس تحقیقی مقالے میں معاصر اُردو افسانے میں سے تحریر کردہ منتخب افسانوں پر کام کرکے افسانہ نگاروں کی خدمات کا ایک تفصیلی جائزہ پیش کیا گیا ہے اور دیکھنے کی کوشش کی گئی ہے کہ افسانہ نگاروں نے کس حد تک متعلقہ موضوعات کو پیش کیا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ مذکورہ عنوان کے تحت منتخب معاصر اُردو افسانے میں استحصال اطفال کی پیش کش کا تجزیہ اقوام متحدہ کے انسانی حقوق کے چارٹر اور آئین پاکستان کو مدِ نظر رکھتے ہوئے گیا ہے۔ دوران تحقیق چارٹر اور آئین پاکستان میں حقوق اطفال اور استحصال حقوق اطفال سے متعلق اہم نکات کو سامنے رکھا گیا ہے۔

۶۔ تحقیقی طریقہ کار(RESEARCH METHODOLOGY)

زیرِ نظر مقالے میں پاکستانی معاصر اُردو افسانے میں استحصال حقوقِ اطفال کی مختلف صورتوں کا جائزہ لیا گیا ہے اور اس سلسلے میں سماجی اور دستاویزی طریقۂ تحقیق اپنایا گیا ہے۔ اس کے پیشِ نظر موجودہ مواد کی جمع آوری، تجزیہ اور اس کی روشنی میں نتائج اخذ کئے گئے ہیں۔ دورانِ تحقیق (Content Analysis Method)یعنی موادی تجزیہ کا طریقہ کار اختیار کیا گیا ہے۔ جس میں مواد کے اجزاء کو جمع کیا جاتا ہے۔ تحقیقی مقالے کا مواد تحدید میں شامل منتخب افسانے ہیں۔ جن کا مطالعہ کرتے ہوئے موضوع کے مطابق تمام تر نکات جو بھی استحصالِ اطفال کی صورتوں، محرکات یا پیش کش سے متعلق ہیں ان کو تلاش کیا گیا ہے۔ اس دوران میں اس بات کا خصوصی طور پر جائزہ لیا گیا کہ منتخب پاکستانی افسانہ نگاروں نے کس طرح سے انسانی حقوق کے لیے بنائے گئے قوانینِ حقوقِ اطفال کو اپنی تحریروں میں شامل کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ آئین پاکستان میں بچوں کے حقوق کے حوالے سے بنائے گئے قوانین اور اہم نکات کو مدِ نظر رکھا گیا ہے۔ مواد کی جمع آوری کے سلسلے میں بنیادی ماخذات سے متعلق رسائی کے لئے تفویض کردہ مقالے سے متعلق کتب خانوں جن میں مختلف جامعات کے کتب خانوں کے ساتھ ساتھ مختلف پبلیشرز جیسا کہ سنگ میل

پبلشر، مثال پبلشر، اکادمی ادبیات، نیشنل بک فاؤنڈیشن اور مقتدرہ قومی زبان جیسے اداروں سے رجوع کیا گیا ہے۔

۷۔ مجوزہ موضوع پر ما قبل تحقیق (WORKS ALREADY DONE)

یوں تو اس موضوع کی اہمیت کو اُجاگر کرنے کے لیے گاہے بگاہے سیمینارز، ٹی وی ڈرامے، ناول، مضامین، آگاہی پروگرام اور عوامی شعور کی بیداری کے لیے مختلف متعلقہ مہمات کا انعقاد کیا جاتا ہے۔ اُردو ادب میں بھی اس کا بیانیہ بھرپور انداز میں موجود ہے۔ لیکن تحقیقی و تنقیدی حوالے سے باقاعدہ طور پر ایسا کوئی کام منظر عام پر نہیں آیا۔ ہمارے مذکورہ مقالے کے ایک ذیلی باب میں چائلڈ لیبر سے متعلق ایک سرسری تذکرہ عمل ایک طالب علم کے تحقیقی مقالے میں موجود ہے جس کا عنوان درج ذیل ہے:
شعیب خالق کے فکشن میں جدید معاشرے کے فرد کے داخلی اور خارجی مسائل"۔ مخزونہ نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز اسلام آباد

۸۔ تحدید (DELIMITATION)

اس تحقیقی مقالے میں حد بندی دو طرح سے کی گئی ہے۔ ایک زمانی اعتبار سے یعنی ۲۰۰۱ء سے اب تک کے منتخب افسانوں کو شامل کیا گیا ہے اور دوسری صورت میں استحصال اطفال کی چار صورتوں کے اعتبار سے۔ ان افسانہ نگاروں کے منتخب کردہ افسانے شامل کیے گئے ہیں جن کے افسانوں میں متعلقہ موضوع موجود تھا۔ اس سلسلے میں جن افسانہ نگاروں کا انتخاب کیا گیا ہے ان میں شعیب خالق، حمزہ حسن شیخ اور مریم مجید ڈار کے افسانے شامل ہیں۔ اس تحقیقی مقالے کے لیے کل (۱۴) افسانوں کا انتخاب کیا گیا ہے۔ دوران تحقیق موضوع سے متعلقہ مزید افسانے سامنے آنے پر ان کو بھی شامل تحقیق کیا گیا ہے۔ اس تحقیقی مقالے میں استحصال اطفال کی چار صورتوں کی پیشکش کا جائزہ لیا گیا ہے۔ جن میں ذہنی و جسمانی استحصال، تعلیمی استحصال، چائلڈ لیبر یا معاشی استحصال اور جنسی استحصال کی پیشکش شامل ہے۔

۹۔ پسِ منظری مطالعہ (LITERATURE REVIEW)

زیرِ نظر تحقیقی مقالے میں پس منظری مطالعہ کے طور پر متعلقہ موضوع پر اُردو ادب میں لکھے گئے فن پاروں اور بالخصوص افسانوں کو مد نظر رکھا گیا ہے۔

اس کے علاوہ اس موضوع کے حوالے سے پیش کی گئی ڈاکومنٹریز، وی لاگز، ڈرامے، کالمز، بی بی سی کی رپورٹس، خبریں اور اس سے متعلقہ جرائم کے حوالے سے دستیاب مواد ہمارے معاشرے میں پیش آنے والے واقعات، استحصال کی مختلف صورتوں کے حوالے سے منعقد کئے گئے سیمینارز، آگہی مہمات بھی پس منظری مطالعہ میں شامل ہیں۔

اقوام متحدہ کے انسانی حقوق کے چارٹر اور آئین پاکستان میں حقوق اطفال کے حوالے سے موجود اہم نکات اور تجاویز شامل ہیں۔

اس موضوع پر کام کرنے کے لیے جن کتب کا مطالعہ کیا گیا ہے ان میں ان میں اکیسویں صدی کے افسانے شامل ہیں۔ اس کے علاوہ اُردو افسانے سے متعلق تحقیقی و تنقیدی کتب جن میں ڈاکٹر انوار احمد کی تصنیف "اُردو افسانہ ایک صدی کا قصہ جو ۲۰۰۸ء میں منظر عام پر آئی۔ اس میں ۱۵۲ افسانہ نگاروں کا تذکرہ شامل ہے۔ اس کے مطالعہ سے ہم قدیم اور جدید افسانہ نگاروں اور ان کے فن سے آگاہی حاصل کر سکتے ہیں۔

اس کے علاوہ شعیب خالق کے افسانوی مجموعے " چھتری نما کہانیاں " اور " بے حرف لفظ " جو کہ ۲۰۱۸ء اور ۲۰۰۴ء میں منظر عام پر آئے پس منظری مطالعہ میں شامل ہیں۔ حمزہ حسن شیخ کا افسانوی مجموعہ "قیدی" جو کہ ۲۰۲۱ء میں شائع ہوا، بھی اس مطالعہ کا حصّہ ہے اور ان تینوں مجموعوں میں موضوع سے متعلقہ افسانے موجود ہیں اوران میں استحصال اطفال کی پیش کش تفصیلی اور بھرپور انداز میں موجود ہے۔ ادب، سماج، انسانیت پبلی کیشنز سے شائع ہونے والی کتاب " انسانیت کا فقدان " بھی پس منظری مطالعہ میں شامل ہے۔ یہ کتاب بچوں کے مسائل پر لکھے گئے مضامین پر مشتمل ہے۔

چند مقالہ جات کو بھی پس منظری مطالعہ میں شامل کیا گیا ہے یہ دو موضوعات ہیں جن پر شعبہ اُردو نمل میں کام ہوا ہے۔ جن میں "پاکستانی اُردو ناول کے تناظر میں انسانی استحصال کا تنقیدی مطالعہ" پر پی۔ ایچ۔ ڈی سکالر طلعت نورین صاحبہ کام کر رہی ہیں۔

ایم فل سکالر سارہ نواز صاحبہ نے ۲۰۲۱ء میں تحقیقی مقالہ "خالد فتح محمد کے ناولوں میں انسانی استحصال کا تجزیاتی مطالعہ بحوالہ " خلیج اندینہ " کے عنوان سے مکمل کیا۔ یہ مقالہ بھی پس منظری مطالعہ میں شامل ہے۔

اس کے علاوہ ڈرامہ سیریل مائے ری، ڈرامہ سیریل اڈاری، ڈرامہ سیریل بندش، ڈرامہ سیریل رہائی، میری گڑیا ڈرامہ سیریل حیوان بھی پس منتظری مطالعہ میں شامل ہیں۔

اس کے علاوہ BBC اور چند دیگر چینلز کی جانب سے نشر کی گئی ڈاکومینٹریز بھی اس مطالعہ کا حصّہ ہیں جن میں:

Preying On Young boys and Pakistan Hidden predators, Produced by Clover Films.
(This content is licensed from TVF internationals.)
Pakistan's Hidden shame: The Forgotten Street Children by TVF Internationals.

ان ڈاکومینٹریز میں میں بچوں کو معاشرے میں پیش آنے والے جنسی استحصالی رویوں اور سنگینیوں کے بارے میں معلومات فراہم کی گئی ہیں۔

Pakistan,s Child maids BBC our World Documentary

یہ ڈاکومینٹری پاکستانی معاشرے میں کم عمر گھریلو ملازمین کے ساتھ روا رکھے جانے والے سلوک کی تصویر کشی کرتی ہے۔ جو کہ حقائق پر مبنی ہے۔

'Hands off our children' -Fighting Abuse in Pakistan- BBC Stories.

BBC کی جانب سے پیش کی گی یہ ڈاکومینٹری پاکستانی معاشرے میں بچوں کے ساتھ جنسی زیادتی کے واقعات پر مشتمل ہے اور اس میں ان واقعات کے محرکات سے متعلق معلومات بھی موجود ہیں۔

Uncovering Eight -Year -Old Children Working in Factories.
(Sahar Zand by VICE World news)
Child Domestic Labour- 2021
By search for justice
Stolen Childhood: The Dark World of Child Labour by Mustafa Ishtiaq
CUBICLES: Documentary on Child Labour in Pakistan by The Zak Films

یہ ڈاکومینٹریز کم عمر بچوں کی جبری مشقت جیسے مسئلے سے متعلق آگاہی فراہم کرنے کے لئے پیش کی گئی ہیں

۱۰۔ تحقیق کی اہمیت (SIGNIFICANCE OF RESEARCH)

استحصال حقوق اطفال موجودہ پاکستانی معاشرے کا ایک سنگین مسئلہ ہے جس کا بیانیہ جامعاتی سطح پر تحقیق طلب ہے تاکہ ان مسائل کے سد باب کے لیے پیش کردہ سفارشات کو بروئے کار لاتے ہوئے بہتر معاشرے کی تشکیل کو ممکن بنایا جاسکے۔ استحصال حقوق اطفال کے حوالے سے تحقیق کا کام ایک منفرد حیثیت رکھتا ہے خاص طور پر اگر افسانوں کے تناظر میں دیکھا جائے تو اس کی اہمیت مزید عیاں ہو جائے گی۔ اس تحقیقی مقالے میں منتخب افسانوں میں استحصال حقوق اطفال کی مختلف صورتوں کا بیان موجود ہے۔ اس تحقیقی مقالے

میں معاصر پاکستانی اُردو افسانے میں حقوق استحصال اطفال کی پیشکش کا تفصیلی جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس مطالعے سے بچوں کے ساتھ معاشرے میں روا رکھے جانے والے استحصالی رویوں کا بغور جائزہ لیا گیا ہے اور یہ تحقیق نہ صرف ادبی سطح پر بلکہ سماجی سطح پر سود مند اور موثر ثابت ہو گی۔

(ب) بنیادی مباحث: استحصال کی صورتیں

بچوں کے استحصال کے حوالے سے درج ذیل صورتیں سامنے آئی ہیں جن کی تفصیل کو اقوام متحدہ اور آئین پاکستان کی رو سے درج کیا گیا ہے۔

ا۔ ذہنی و جسمانی استحصال:

ادب میں تخلیق کیے گئے بچوں کے کردار عام طور پر معصومیت، سادگی اور تخلیقی دنیا کے گرد گھومتے ہیں لیکن جب اس میں سماجی حقیقتوں، استحصال، ناانصافی اور طبقاتی تضادات کا عنصر شامل ہوتا ہے تو یہ ادب محض تفریح کا ذریعہ نہیں رہتا بلکہ سماج کے اس اہم رویے پر سوچنے کا موقع بھی دیتا ہے۔ اُردو کے ابتدائی افسانہ نگاروں میں منشی پریم چند، اعظم کریون، اوپندر ناتھ اشک کے ہاں ایسے افسانے موجود ہیں جو بچوں کے مسائل اور ان کے ذہنی استحصال کی صورتوں کو واضح کرتے ہیں۔ ان موضوعات پر لکھے گئے افسانے کم ہیں اور بعض صورتوں میں ایسا بھی ہے کہ اہم افسانہ نگاروں نے بچوں کے ذہنی اور جسمانی مسائل استحصال کی صورتوں کو کم بیان کیا ہے لیکن جن افسانہ نگاروں نے انہیں بیان کیا ہے وہ اپنی مکمل جزیات کے ساتھ ان کو بیان کرتے ہیں۔ اس موضوع کے اعتبار سے کئی افسانوں کا حوالہ پیش کیا جا سکتا ہے لیکن اس حوالے سے منشی پریم چند کا افسانہ "عید گاہ" اہم افسانہ ہے۔

اس میں ایک بچے کا کردار پیش کیا گیا ہے جو بچپن میں ہی غربت اور استحصال کا سامنا کرتا ہے۔ اس افسانے میں حمید کا کردار اس طبقاتی فرق کو اُجاگر کرتا ہے جہاں غریب بچوں کی عید بھی قربانی اور ایثار کے گرد گھومتی ہے جبکہ امیر طبقے کے بچوں کے لیے یہ محض خوشی کا تہوار رہتا ہے۔ اسی طرح، پریم چند کے دیگر افسانے بھی بچوں کی نفسیات اور ان کے ساتھ ہونے والے معاشرتی سلوک کو بیان کرنے میں کامیاب نظر آتے ہیں۔

سعادت حسن منٹو، جو حقیقت نگاری اور سماجی جبر کے بیانیے میں اپنی مثال آپ ہیں، نے بھی بچوں کے استحصال کے حوالے سے نہایت گہری کہانیاں تخلیق کیں۔ منٹو کا افسانہ "خوشیا" میں بھی ایک ایسا ہی کردار نظر آتا ہے۔ بچوں کو محض جسمانی ہی نہیں بلکہ ذہنی اور جذباتی استحصال کا سامنا بھی کرنا پڑتا ہے۔ سعادت حسن منٹو اپنے افسانے "خوشیا" میں لکھتے ہیں:

> "خوشیا کی زندگی میں بچپن کا کوئی تصور نہیں تھا۔ وہ پیدا ہوتے ہی جوان ہو گیا تھا، جیسے غریبی میں بچے کھیلنے کودنے کی عمر میں ہی کام کاج پر لگ جاتے ہیں۔ اس کے لیے زندگی ایک مسلسل جدوجہد تھی، جہاں معصومیت اور بچپن کی خوشیاں محض خواب بن کر رہ گئی تھیں۔"(۱)

منٹو کا افسانہ خوشیا ایک ایسے کردار کی کہانی ہے جو بچپن ہی میں زندگی کے تلخ حقائق سے نبرد آزما ہو جاتا ہے۔ خوشیا صرف ایک فرد نہیں بلکہ ان تمام بچوں کی علامت ہے جنہیں بچپن میں ہی بڑے ہونے پر مجبور کر دیا جاتا ہے۔ غربت، طبقاتی تقسیم اور محرومیوں کا ایسا جال اس کے گرد بنتا چلا جاتا ہے کہ اس کی معصومیت اور فطری خوشیاں کہیں کھو جاتی ہیں۔ بچپن جو عام طور پر کھیل کود، آزادی اور تخلیقی اظہار کا دور ہوتا ہے، خوشیا کے لیے محض ایک ایسی جدوجہد بن جاتا ہے جہاں صرف بقا ہی سب سے بڑی حقیقت رہ جاتی ہے۔ یہ ذہنی استحصال کی ایک ایسی صورت ہے جس میں بچہ اپنے احساسات کے فطری اظہار سے محروم ہو جاتا ہے۔ وہ نہ کھل کر ہنس سکتا ہے، نہ رو سکتا ہے، نہ خوش ہو سکتا ہے اور نہ ہی کسی شوق کو پروان چڑھا سکتا ہے۔ یہی نفسیاتی گھٹن اس کے شعور کو دبا دیتی ہے اور اسے ایک ایسی زندگی میں دھکیل دیتی ہے جہاں جذبات کی کوئی وقعت نہیں رہتی۔

خوشیا کے ساتھ ہونے والا استحصال محض جسمانی نہیں بلکہ ذہنی بھی ہے کیونکہ اسے صرف محنت مشقت کا سامنا نہیں بلکہ مسلسل ایک ایسے نفسیاتی دباؤ میں رہنا پڑتا ہے جہاں وہ اپنی شناخت اور وجود کے لیے ترستا ہے۔ اسے زندگی میں ایک بار بھی وہ جذباتی آسودگی نصیب نہیں ہوتی جو بچوں کی ذہنی نشوونما کے لیے ناگزیر ہے۔ وہ نہ ماں کی محبت محسوس کر پاتا ہے، نہ باپ کی شفقت اور نہ ہی کسی اور قریبی رشتے سے وہ اپنائیت حاصل کر پاتا ہے۔ نتیجتاً، وہ ایک مشینی انداز میں جینے پر مجبور ہو جاتا ہے جہاں زندگی کی خوبصورتی اور معصوم خواب سب کچھ بے معنی ہو جاتے ہیں۔ اُردو افسانے میں بچوں کی غربت اور جسمانی استحصال پر تو کبھی کبھار

بات کی گئی لیکن ان کے ذہنی استحصال کے حوالے سے کوئی خاص توجہ نہیں دی گئی۔ حالانکہ بچوں کی ذہنی صحت، ان کی شناخت، جذباتی ضروریات اور نفسیاتی دباؤ کے مسائل کسی بھی معاشرے کے لیے نہایت اہم ہوتے ہیں مگر اُردو ادب میں اس موضوع کو کم ہی جگہ دی گئی ہے۔

ایک ایسا فرد جو مسلسل ذہنی اور جسمانی استحصال کا شکار ہو، وہ آہستہ آہستہ اپنی معصومیت اور انسانیت کھو دیتا ہے۔ ایسے بچے زندگی کے جذباتی پہلوؤں سے بیگانہ ہو جاتے ہیں اور ان کی معصوم خواہشات معاشی مسائل کے بوجھ تلے دب کر دم توڑ دیتی ہیں۔ اُردو ادب میں طبقاتی فرق، غربت اور محرومیوں پر کئی تحریریں لکھی گئی ہیں مگر بچوں کے نفسیاتی استحصال کو ایک مرکزی مسئلہ بنا کر پیش کرنے کی روایت بہت کمزور رہی ہے۔ بچوں کا ادب عام طور پر ان کی معصومیت، سادگی اور تخلیقی دنیا کے گرد گھومتا ہے مگر جب سماجی حقیقتوں، طبقاتی ناانصافیوں اور استحصال کی بات ہو تو ان کے ذہنی اثرات پر کم ہی روشنی ڈالی جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ خوشیا جیسے کردار ہمارے ادب میں کم ملتے ہیں حالانکہ حقیقت میں وہ ہمارے معاشرے میں بے شمار تعداد میں موجود ہیں۔

اس حوالے سے عصمت چغتائی کا نام بھی قابل ذکر ہے، جنھوں نے "ننھا منا" جیسے افسانوں میں بچوں کی معصومیت اور ان کے استحصال کے مختلف پہلوؤں کو نمایاں کیا ہے۔ ان کے بیانیے میں بچوں کی نفسیاتی دنیا کو سمجھنے اور ان کے ساتھ ہونے والی زیادتیوں کو اُجاگر کرنے کا ایک منفرد انداز پایا جاتا ہے۔ ان کی تحریریں اس امر کی نشاندہی کرتی ہیں کہ بچوں کے استحصال کے پیچھے صرف غربت اور طبقاتی فرق نہیں بلکہ ایک وسیع تر سماجی ڈھانچہ کارفرما ہوتا ہے۔ کرشن چندر کا افسانہ "مہالکشمی کا پل" بھی اس حوالے سے ایک اہم مثال ہے۔ اس میں جنگ اور غربت کے پس منظر میں بچوں کی حالت زار کو نہایت دردمندی سے بیان کیا گیا ہے۔ ان کی تحریریں ہمیں دکھاتی ہیں کہ کس طرح جنگ اور سماجی بحران بچوں کے ذہنی اور جسمانی استحصال کو مزید بڑھا دیتے ہیں۔ اکبر رحمانی لکھتے ہیں:

> "بچوں کے حوالے سے تخلیق کردہ ادبی فن پارے کم لکھے گئے ہیں تاہم ان پر بات بھی کم کی جاتی ہے۔ تخلیق کتاب کا مقصد ان فن پاروں پر روشنی ڈالنا ہے جو ادب کے حوالے سے تخلیق کیے گئے ہیں۔ اس ضمن میں نہایت ہی قابل قدر تخلیق کاروں کی تحریریں میں نے پڑھی ہیں جو ادب کی اس اہم جہت کی طرف اشارہ کرتی ہیں۔"(۲)

جدید اُردو ادب میں بھی بچوں کے استحصال پر بہت سے اہم افسانے تخلیق کیے گئے ہیں۔ مستنصر حسین تارڑ، انتظار حسین اور دیگر معاصر افسانہ نگاروں کے ہاں بھی ایسے کردار ملتے ہیں جو بچپن کے المیوں اور بچوں پر ہونے والے جبر کی مختلف شکلوں کو نمایاں کرتے ہیں۔اس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ اُردو ادب میں بچوں کے ذہنی اور جسمانی استحصال کے موضوع پر گہرائی سے کام کیا گیا ہے۔ یہ کہانیاں نہ صرف حقیقت نگاری کی عمدہ مثالیں ہیں بلکہ یہ ایک ایسے سماج کی عکاس بھی ہیں جو بچوں کے مسائل کو اکثر نظر انداز کر دیتا ہے۔ان کہانیوں کی روشنی میں دیکھا جائے تو بچوں کا ادب محض تفریح کا ذریعہ نہیں بلکہ ان کے حقوق کی پاسداری اور استحصال کے خلاف ایک موثر آواز بھی ہے۔

۲۔ تعلیمی استحصال:

اس موضوع کو ادب میں کم برتا گیا ہے۔اُردو ادب کے اہم افسانہ نگاروں نے اس موضوع پر کم کم افسانے لکھے ہیں، بعض افسانوں میں اس مسئلے کو جزوی طور پر بیان کیا گیا ہے، لیکن عمومی طور پر یہ ایک پس منظر کی حقیقت کے طور پر ہی سامنے آیا ہے۔ جو افسانے تعلیمی استحصال پر لکھے گئے وہ زیادہ تر دیگر سماجی مسائل کے تناظر میں پیش کیے گئے، جس کی وجہ سے یہ مسئلہ ادبی مباحث میں بیان کیا گیا ہے۔ تعلیمی استحصال کسی بھی بچے کی ذہنی نشوونما اور شخصیت پر گہرے اثرات مرتب کرتا ہے۔جب کسی بچے کو تعلیم حاصل کرنے کے بنیادی حق سے محروم رکھا جاتا ہے یا اس کے تعلیمی سفر میں رکاوٹیں کھڑی کی جاتی ہیں تو یہ عمل نہ صرف اس کی تعلیمی ترقی کو محدود کرتا ہے بلکہ اس کی خود اعتمادی، تخلیقی صلاحیت اور ذہنی سکون کو بھی متاثر کرتا ہے۔

تعلیم کی عدم دستیابی بچوں کو ایک ایسے دائرے میں مقید کر دیتی ہے جہاں وہ نہ تو اپنے امکانات کو سمجھ پاتے ہیں اور نہ ہی اپنی زندگی کو بہتر بنانے کے قابل ہوتے ہیں۔ یہ استحصال مختلف شکلوں میں ظاہر ہوتا ہے۔ بعض اوقات غربت کی بنا پر بچوں کو تعلیمی سہولتوں سے دور رکھا جاتا ہے جبکہ بعض اوقات خاندانی یا سماجی دباؤ انہیں تعلیم کی روشنی سے محروم کر دیتا ہے۔ سگمنڈ فرائیڈ نے بچوں کی تعلیمی نفسیات کے حوالے سے خاص طور پر ان کے جذباتی اور لاشعوری عوامل پر زور دیا ہے۔ ان کے مطابق: ”ایک بچے کی ابتدائی زندگی کے تجربات اس کی سیکھنے کی صلاحیت اور تعلیمی رجحانات پر گہرے اثرات مرتب کرتے ہیں۔ وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ بچے کی نفسیاتی نشوونما میں اس کے والدین، اساتذہ اور ارد گرد کے ماحول کا کردار انتہائی اہم ہوتا ہے“۔ فرائیڈ کے نظریے کی وضاحت کرتے ہوئے شہزاد احمد لکھتے ہیں:

"بچے کی ابتدائی خواہشات اور جذبات اس کے لاشعور میں بسی ہوتی ہیں اور اگر ان کو دبایا جائے تو یہ تعلیمی کارکردگی میں رکاوٹ بن سکتی ہیں۔ ایک صحت مند تعلیمی ماحول وہی ہے جو بچے کی اندرونی نفسیاتی کشمکش کو سمجھتے ہوئے اس کی رہنمائی کرے۔"(۳)

بچوں کی تعلیمی نفسیات کو سمجھنے کے لیے صرف ان کے ظاہری رویے پر نہیں بلکہ ان کے اندرونی جذبات، خوف اور دبے ہوئے خیالات پر بھی غور کرنا ضروری ہے۔ ایسے بچے جو مسلسل محرومی اور دباؤ کا شکار رہتے ہیں وہ اپنے ہم عمروں کے مقابلے میں زیادہ احساسِ کمتری کا شکار ہو جاتے ہیں اور ان کی ذہنی استعداد بھی دباؤ کی وجہ سے کمزور پڑنے لگتی ہے۔ تعلیم سے محرومی ایک نفسیاتی بوجھ بھی بن جاتی ہے جو مستقبل میں ان کے فیصلہ سازی کے عمل اور زندگی کے دیگر پہلوؤں پر اثر انداز ہوتی ہے۔ ایک ایسا معاشرہ جو بچوں کے تعلیمی حقوق کو نظر انداز کرتا ہے وہ درحقیقت اپنی ترقی کے امکانات کو خود ہی محدود کر لیتا ہے۔ بچوں کی ذہنی نشوونما اور ان کی صلاحیتوں کے نکھار کے لیے ایک ایسا تعلیمی نظام ضروری ہے جو انہیں خود مختاری، تخلیقی سوچ اور بہتر زندگی کے خواب دیکھنے کے قابل بنائے۔ بصورت دیگر تعلیمی استحصال نہ صرف فرد بلکہ پورے سماج کے لیے زوال کا باعث بنتا ہے۔

جب کسی بچے کو تعلیم حاصل کرنے کے بنیادی حق سے محروم رکھا جاتا ہے یا اس کے تعلیمی سفر میں رکاوٹیں کھڑی کی جاتی ہیں تو یہ عمل نہ صرف اس کی تعلیمی ترقی کو محدود کرتا ہے بلکہ اس کی خود اعتمادی، تخلیقی صلاحیت اور ذہنی سکون کو بھی متاثر کرتا ہے۔ تعلیم کی عدم دستیابی بچوں کو ایک ایسے دائرے میں مقید کر دیتی ہے جہاں وہ نہ تو اپنے امکانات کو سمجھ پاتے ہیں اور نہ ہی اپنی زندگی کو بہتر بنانے کے قابل ہوتے ہیں۔ یہ استحصال مختلف شکلوں میں ظاہر ہوتا ہے۔ بعض اوقات غربت کی بنا پر بچوں کو تعلیمی سہولتوں سے دور رکھا جاتا ہے جبکہ بعض اوقات خاندانی یا سماجی دباؤ انھیں تعلیم کی روشنی سے محروم کر دیتا ہے۔ ایسے بچے جو مسلسل محرومی اور دباؤ کا شکار رہتے ہیں وہ اپنے ہم عمروں کے مقابلے میں زیادہ احساسِ کمتری کا شکار ہو جاتے ہیں اور ان کی ذہنی استعداد بھی دباؤ کی وجہ سے کمزور پڑنے لگتی ہے۔

تعلیم سے محرومی ایک نفسیاتی بوجھ بھی بن جاتی ہے جو مستقبل میں ان کے فیصلہ سازی کے عمل اور زندگی کے دیگر پہلوؤں پر اثر انداز ہوتی ہے۔ ایک ایسا معاشرہ جو بچوں کے تعلیمی حقوق کو نظر انداز کرتا ہے،

وہ در حقیقت اپنی ترقی کے امکانات کو خود ہی محدود کر لیتا ہے۔ بچوں کی ذہنی نشوونما اور ان کی صلاحیتوں کے نکھار کے لیے ایک ایسا تعلیمی نظام ضروری ہے جو انہیں خود مختاری، تخلیقی سوچ اور بہتر زندگی کے خواب دیکھنے کے قابل بنائے۔ بصورت دیگر، تعلیمی استحصال نہ صرف فرد بلکہ پورے سماج کے لیے زوال کا باعث بنتا ہے۔

۳۔ چائلڈ لیبر یا معاشی استحصال:

اُردو افسانہ ہمیشہ سے انسانی المیوں، طبقاتی تضادات اور سماجی ناانصافیوں کا آئینہ دار رہا ہے۔ خاص طور پر چائلڈ لیبر اور معاشی استحصال جیسے موضوعات اُردو افسانہ نگاروں کے لیے ایک مستقل سوال بنے رہے ہیں۔ اس کا سبب یہ ہے کہ برصغیر کی معاشرت میں غربت، بے روزگاری اور استحصال کے مظاہر اتنے عام ہیں کہ ادیب کی نظر ان سے صرفِ نظر نہیں کر سکتی۔ چائلڈ لیبر محض ایک معاشی مسئلہ نہیں بلکہ ایک سماجی اور نفسیاتی سانحہ بھی ہے۔ اُردو افسانے میں یہ موضوع مختلف ادوار میں مختلف انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ ابتدائی دور میں ترقی پسند تحریک سے وابستہ افسانہ نگاروں نے اسے زیادہ شدت سے بیان کیا ہے۔ ان کے ہاں محنت کش بچوں کے کردار نہ صرف استحصال کی عکاسی کرتے ہیں بلکہ ایک گہرے احتجاج کی صورت میں بھی اُبھرتے ہیں۔ منٹو، کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی اور عصمت چغتائی جیسے ادیبوں نے چائلڈ لیبر کے موضوع کو اس طرح پیش کیا کہ قاری اس درد کو محسوس کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔

کرشن چندر کے افسانے "مہمان" میں ایک معصوم بچہ جو ہوٹل میں کام کرتا ہے محض اپنی زندگی گزارنے کے لیے مشقت کرتا ہے مگر اس کی معصومیت، اس کے خواب، سب اسی استحصالی نظام کے ہاتھوں روندے جاتے ہیں۔ اسی طرح یہ افسانے ان بچوں کی بے بسی کی جھلک دکھاتے ہیں جو محض چند سکوں کے عوض اپنی پوری زندگی کا سودا کر دیتے ہیں۔

محمد رفیع اللہ اپنے مضمون میں لکھتے ہیں:

> "میرا موضوع 'بچوں کا ادب' ہے، جس کی سماجیات پر میں محدود نکات کے ساتھ ایک مضمون لکھ چکا ہوں۔ اس مضمون کو اسی کے تسلسل میں دیکھا جا سکتا ہے۔ ہمارے سماج میں 'مثبت تنقید' کا مطلب بہت واضح طور پر سمجھا جاتا ہے۔ ایسی تنقید جس سے مصنف برافروختہ نہ ہو۔ لفظ تنقید کے ساتھ کوئی اور اضافی صفت جوڑ کر یہ بتانے کی کوشش کی جاتی ہے کہ نقاد بری نیت رکھتا ہے، حسد رکھ کر 'برائی' کر رہا ہے۔ یہ کتنا بڑا المیہ ہے کہ

ادب کے دائرے کے اندر رہتے ہوئے بھی وابستہ لوگوں میں تنقید اور برائی ہم معنی سمجھے جائیں۔(۴)

ان کہانیوں میں چائلڈ لیبر ایک ذاتی سانحہ ہی نہیں بلکہ ایک سماجی سچائی کے طور پر اُبھرتی ہے جو پورے نظام پر سوالیہ نشان لگاتی ہے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اُردو افسانے میں چائلڈ لیبر کا موضوع زیادہ گہرے نفسیاتی اور سماجی پس منظر کے ساتھ سامنے آیا ہے۔ جدید افسانہ نگاروں نے بچوں کے استحصال کو محض معاشی مسئلہ نہیں بلکہ ایک ایسا المیہ قرار دیا جس کا تعلق انسانی رویوں، ریاستی بے حسی اور معاشرتی زوال سے بھی ہے۔ محمد حمید شاہد، مرزا اطہر بیگ اور خالد جاوید جیسے ادیبوں نے اپنے افسانوں میں چائلڈ لیبر کو ایک علامتی بیانیے کے ذریعے پیش کیا جہاں یہ ایک مخصوص طبقے کے بچوں کی محرومی کا نوحہ بن جاتا ہے۔ چائلڈ لیبر پر لکھے گئے اُردو افسانوں میں جو چیز سب سے زیادہ نمایاں ہے وہ ان بچوں کی مجبوری اور بے بسی ہے۔ یہ کہانیاں ہمیں ان خوابوں کی جھلک دکھاتی ہیں جو غربت اور جبر کی چکی میں پس کر ریزہ ریزہ ہو جاتے ہیں۔ ایک معصوم بچہ جو کھلونے سے کھیلنے کی عمر میں ہوٹلوں میں برتن دھوتا ہے، ورکشاپ میں تیل اور دھوئیں میں کھو جاتا ہے یا کسی امیر گھر میں جھاڑو پونچھا کرتا ہے، وہ صرف اپنی ذات کا نقصان نہیں اُٹھاتا بلکہ ایک پورے سماج کے اخلاقی زوال کی گواہی دیتا ہے۔

یہ افسانے ہمیں مجبور کرتے ہیں کہ ہم اس حقیقت کو محض اعداد و شمار کی روشنی میں نہ دیکھیں بلکہ ان بچوں کے جذبات اور ان کے کھوئے ہوئے بچپن کے تناظر میں پرکھیں۔ اُردو افسانہ ہمیں چائلڈ لیبر کو ایک خشک سماجی مسئلے کے بجائے ایک زندہ اور دھڑکتے ہوئے انسانی المیے کے طور پر دیکھنے پر مجبور کرتا ہے، جہاں ہر بچہ محض مزدور نہیں بلکہ ایک ادھورا خواب ہے۔ شبیر سالک لکھتے ہیں:

> "یہاں کے پسماندہ خاندان اپنے بچوں کو جبری مشقت پر مجبور کرتے ہیں۔ اس جبری مشقت کی کئی صورتیں ہو سکتی ہیں۔ یہ پسماندہ خاندان چند پیسوں کے لیے اپنے بچوں کو کئی طرح کے کام کرنے پر مجبور کرتے ہیں۔ ایسے پسماندہ خاندان میں عام رواج بچے پیدا کرنا اور ان سے جبری مشقت لینا ہے۔"(۵)

چائلڈ لیبر ایک سنگین سماجی مسئلہ ہے۔ اُردو میں اس پر کئی افسانہ نگاروں نے افسانے تحریر کیے ہیں جو نہ صرف بچوں کی جسمانی نشوونما کو واضح کرتے ہیں بلکہ ان کی ذہنی اور نفسیاتی حالت پر بھی گہرے نقوش کو بھی

بیان کرتے ہیں۔ جب بچے کم عمری میں محنت و مشقت پر مجبور ہوتے ہیں تو ان کی معصومیت، سیکھنے کی صلاحیت اور معاشرتی رویے شدید متاثر ہوتے ہیں۔ اس کے نتیجے میں وہ اپنی عمر کے دیگر بچوں کے ساتھ گھلنے ملنے سے محروم رہتے ہیں۔ وہ تعلیمی اداروں سے دور ہو جاتے ہیں اور کھیل کود جیسے مثبت سرگرمیوں میں شرکت نہیں کر پاتے۔ اس کے نتیجے میں ان میں احساسِ محرومی پیدا ہوتا ہے اور وہ خود کو تنہا محسوس کرتے ہیں۔ ان بچوں میں عدم تحفظ کا احساس بڑھ جاتا ہے کیونکہ ان کے ساتھ اکثر ناپسندیدہ سلوک کیا جاتا ہے جس کی وجہ سے ان کا اعتماد مجروح ہوتا ہے۔

تعلیم ہر بچے کا بنیادی حق ہے لیکن چائلڈ لیبر میں ملوث بچے اس حق سے محروم ہو جاتے ہیں۔ یہ بچے علم کی روشنی سے دور ہو کر کام کی سختیوں میں الجھ جاتے ہیں جس کے باعث ان کے اندر احساسِ کمتری پیدا ہونے لگتا ہے۔ تعلیم کی کمی ان کے مستقبل کو محدود کر دیتی ہے جس کے باعث وہ اپنی زندگی کو بہتر بنانے کی صلاحیت سے محروم ہو جاتے ہیں۔ چائلڈ لیبر کے شکار بچے اکثر سخت اور غیر منصفانہ روّیوں کا سامنا کرتے ہیں۔ بعض اوقات یہ بچے جسمانی اور ذہنی استحصال کا بھی شکار ہو جاتے ہیں، جس سے ان میں شدید غصہ اور جارحیت پیدا ہو سکتی ہے۔ مسلسل ناانصافی کے باعث ان کا رویہ تلخ ہو سکتا ہے اور وہ سماج کے خلاف ایک منفی سوچ اپنا سکتے ہیں۔ یہ رویہ نہ صرف ان کے ذاتی تعلقات پر اثر انداز ہوتا ہے بلکہ سماجی ہم آہنگی کو بھی نقصان پہنچاتا ہے۔

چائلڈ لیبر میں مبتلا بچوں کو سخت محنت، غیر انسانی سلوک اور جذباتی بدسلوکی کا سامنا کرنا پڑتا ہے جو انہیں ذہنی تناؤ، اضطراب اور ڈپریشن میں مبتلا کر سکتا ہے۔ کم عمری میں بوجھ اٹھانے کی وجہ سے ان کی شخصیت میں غیر یقینی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے اور وہ اپنی خودی کو کھو دیتے ہیں۔ بعض بچے خود اعتمادی کی کمی کا شکار ہو جاتے ہیں جبکہ کچھ دوسروں پر شک کرنے لگتے ہیں۔ جب بچے بچپن میں ہی مشقت کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں تو ان کے لیے ایک بہتر مستقبل کا تصور بھی دھندلا ہو جاتا ہے۔ وہ محض روزمرہ کی ضروریات پوری کرنے میں مصروف رہتے ہیں اور ان کے خواب اور اُمنگیں دم توڑ دیتی ہیں۔ ایسے بچے اکثر بالغ ہو کر معاشرتی ناانصافیوں کا شکار رہتے ہیں اور بعض اوقات غیر قانونی سرگرمیوں میں بھی ملوث ہو جاتے ہیں۔ نتیجتاً، چائلڈ لیبر نہ صرف انفرادی بلکہ مجموعی طور پر معاشرے کی ترقی میں بھی رکاوٹ بن جاتی ہے۔ یہ بچوں کی معصومیت، تعلیم اور

ذہنی نشوونما کو متاثر کرتی ہے۔ اس کے نتیجے میں بچے سماجی تنہائی، عدم تحفظ، ذہنی دباؤ اور جذباتی مسائل کا شکار ہو جاتے ہیں۔

اس مسئلے کے حل کے لیے ضروری ہے کہ حکومت، والدین اور سماجی تنظیمیں مل کر ایسے اقدامات کریں جو بچوں کو محفوظ اور تعلیم یافتہ مستقبل فراہم کر سکیں۔ چائلڈ لیبر کا خاتمہ صرف قانونی اقدامات سے ممکن نہیں بلکہ اس کے لیے اجتماعی شعور بیدار کرنا بھی ضروری ہے تاکہ ہر بچہ اپنی فطری صلاحیتوں کو اُجاگر کر کے ایک بہتر زندگی گزار سکے۔

۴۔ جنسی استحصال:

بچوں کا جنسی استحصال ایک عالمی مسئلہ ہے جو انسانی حقوق کی سنگین خلاف ورزی کے زمرے میں آتا ہے۔ یہ وہ عمل ہے جس میں کسی بالغ فرد یا کسی عمر میں برتر شخص کے ذریعے کسی نابالغ بچے کا جنسی استحصال کیا جاتا ہے۔ اس میں زبردستی، دھمکی، جذباتی دباؤ یا کسی بھی ایسی صورتحال کا فائدہ اٹھایا جاتا ہے جہاں بچہ خود کی حفاظت کرنے کے قابل نہ ہو۔ یہ استحصال نہ صرف جسمانی زیادتی تک محدود ہوتا ہے بلکہ اس میں فحش مواد کی تخلیق، زبانی ہراسانی، غیر مناسب رویہ اور بچے کی رضامندی کے بغیر کسی بھی قسم کی جنسی نمائش شامل ہو سکتی ہے۔

یہ مسئلہ دنیا کے ہر خطے میں پایا جاتا ہے اور مختلف سماجی، نفسیاتی اور اقتصادی عوامل اس کے فروغ میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ غریب اور کمزور طبقات میں اس کا شکار ہونے کے امکانات زیادہ ہوتے ہیں جہاں بچوں کی تعلیم، قانونی مدد اور والدین کی آگاہی محدود ہوتی ہے۔ خاندانی نظام میں موجود کمزوری، والدین کی غیر موجودگی اور جدید دور میں انٹرنیٹ کے ذریعے بچوں کا غیر محفوظ رہنا بھی اس کے بڑھتے ہوئے خطرات میں شامل ہیں۔ جنسی استحصال کے شکار بچوں پر گہرے نفسیاتی اثرات مرتب ہوتے ہیں جو ان کی شخصیت، رویے اور مستقبل کے تعلقات پر منفی انداز میں اثرانداز ہو سکتے ہیں۔ یہ بچے بڑے ہو کر شدید ذہنی دباؤ، عدم اعتماد اور خوف میں مبتلا رہ سکتے ہیں، جبکہ بعض صورتوں میں وہ خود استحصالی رویے اپنانے پر مجبور ہو سکتے ہیں۔ معاشرتی سطح پر یہ مسئلہ ایک بڑی اخلاقی اور قانونی پیچیدگی کا سبب بنتا ہے جسے حل کرنے کے لیے مؤثر قوانین، بیداری مہمات اور بچوں کے حقوق کے تحفظ پر زور دینا ضروری ہے۔ عالمی ادب میں بچوں کے جنسی استحصال پر

کئی ناول، کہانیاں اور تحقیقاتی مطالعات تحریر کیے گئے ہیں جو نہ صرف اس سنگین مسئلے کی تفہیم میں مدد دیتے ہیں بلکہ اس کے خلاف شعور اجاگر کرنے کا بھی ذریعہ بنتے ہیں۔ رئیس امروہی لکھتے ہیں:

> "مغربی ادب میں بچوں کے جنسیاتی واقعات بھی ان کے ادب کا حصّہ ہیں۔ بنیادی طور پر نفسیاتی دبستان نے ایسے واقعات کی تشریح ان مطالعات پر کی ہے جو فرد کی ذہنی حالت کو بیان کرتے ہیں۔ ہمارے سماج میں ہونے والے واقعات بھی اسی ذیل میں آتے ہیں۔ اس استحصال کی بعض صورتیں اتنی گھناونی ہیں کہ معاشرے کی صورت گری کو مسخ کر دیتی ہیں۔"(۶)

ولیم گولڈنگ کا ناول "لارڈ آف دی فلائز" (Lord of the Flies) بچوں کی فطرت اور ان پر ہونے والے استحصال کے حوالے سے ایک علامتی بیانیہ پیش کرتا ہے۔ اگرچہ یہ براہِ راست جنسی استحصال پر مبنی نہیں مگر اس میں دکھایا گیا ہے کہ جب سماجی اُصول اور ضابطے ختم ہو جاتے ہیں تو کمزور طبقے پر جبر اور استحصال کیسے بڑھ جاتا ہے۔ امریکن ادیب ڈیو ایجرز (Dave Eggers) کے ناول "What is the What" میں سوڈانی جنگ کے دوران بچوں کے ساتھ ہونے والے ظلم و ستم کی داستان موجود ہے۔ اسی طرح ایلی ویزل کا ناول "نائٹ" (Night) ہولوکاسٹ کے دوران بچوں پر ہونے والے استحصال کو بیان کرتا ہے، جس میں جسمانی و ذہنی تشدد نمایاں ہیں۔

اُردو ادب میں بچوں کے جنسی استحصال پر کم لیکن اہم کام کیا گیا ہے۔ کرشن چندر اور جیلانی بانو جیسے افسانہ نگاروں نے استحصال اور ظلم کی مختلف شکلوں پر کہانیاں تحریر کی ہیں۔ جیلانی بانو کی تحریریں خواتین اور بچوں پر ہونے والے ظلم کو اجاگر کرتی ہیں جن میں استحصال کے مختلف زاویے نمایاں کیے گئے ہیں۔ جدید اُردو ادب میں بھی ایسے موضوعات پر بحث کی جارہی ہے مگر اس حوالے سے مزید تحقیقی اور تخلیقی کام کی ضرورت ہے۔ بچوں کا جنسی استحصال ایک عالمی مسئلہ ہے جو ہر سماج میں مختلف طریقوں سے موجود ہے۔ عالمی ادب میں اس کی عکاسی کے ذریعے سماج میں بیداری پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ہے جبکہ اُردو ادب میں بھی اس موضوع پر کہانیاں اور افسانے تحریر کیے گئے ہیں۔ تاہم، اُردو ادب میں اس پر مزید تحقیق اور اظہار کی ضرورت ہے تاکہ سماج میں بچوں کے تحفظ اور آگاہی کے لیے مزید اقدامات کیے جاسکیں۔

نفسیاتی تجزیے میں بچوں کے جنسی استحصال کے موضوع پر مختلف نظریات پیش کیے گئے ہیں جن میں سگمنڈ فرائیڈ، الفریڈ ایڈلر اور کارل یونگ کی آرا کو نمایاں مقام حاصل ہے۔ ان تینوں ماہرینِ نفسیات نے انسانی نفسیات کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے اور بچوں کے ساتھ ہونے والے جنسی استحصال کے حوالے سے بھی ان کے خیالات میں نمایاں فرق پایا جاتا ہے۔

سگمنڈ فرائیڈ نے ابتدا میں بچوں کے جنسی استحصال کو ایک حقیقت کے طور پر تسلیم کیا اور اپنی ابتدائی تحقیق میں بیان کیا کہ کئی نفسیاتی مسائل کی جڑیں بچپن میں ہونے والے جنسی تجربات میں ہوتی ہیں۔ تاہم، بعد میں اُنھوں نے "سیڈکشن تھیوری" کو ترک کر دیا اور یہ مؤقف اختیار کیا کہ زیادہ تر کیسز میں بچوں کے جنسی استحصال کے واقعات اصل میں لاشعوری تصورات اور خواہشات کی پیداوار ہوتے ہیں۔ اُنھوں نے نفسیاتی ترقی کو مختلف مراحل میں تقسیم کیا اور اس کے ذریعے وضاحت کی کہ کیسے ابتدائی تجربات انسانی شخصیت پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ تاہم، جدید محققین فرائیڈ کے اس رویے پر تنقید کرتے ہیں کہ اُنھوں نے حقیقی استحصال کو نظر انداز کر کے زیادہ تر واقعات کو نفسیاتی فینٹسی سے جوڑنے کی کوشش کی۔

الفریڈ ایڈلر نے اس مسئلے کو مختلف زاویے سے دیکھا۔ وہ انسانی نفسیات میں سماجی پہلو کو زیادہ اہمیت دیتے تھے اور ان کا خیال تھا کہ بچپن میں ہونے والا جنسی استحصال فرد کے احساسِ کم تری اور خودی کے مسائل کو بڑھا سکتا ہے۔ ایڈلر کے مطابق، جنسی استحصال کا شکار ہونے والے بچے اکثر خود کو کمزور اور بے بس محسوس کرتے ہیں اور یہ تجربہ ان کے مستقبل کے تعلقات اور نفسیاتی صحت پر دیرپا اثرات ڈال سکتا ہے۔ ان کے مطابق "اگر کسی بچے کو بچپن میں شدید صدمہ پہنچے تو وہ یا تو دوسروں پر غلبہ پانے کی کوشش کرے گا یا پھر مکمل طور پر خود کو معاشرتی طور پر الگ تھلگ کر لے گا"۔ شہزاد احمد لکھتے ہیں:

> "ایڈلر کے مطابق، بچوں کے ابتدائی تجربات ان کی شخصیت کی تشکیل میں بنیادی کردار ادا کرتے ہیں اور اگر کوئی بچہ جنسی استحصال جیسے صدمے سے گزرتا ہے تو اس کے اثرات اس کی پوری زندگی پر مرتب ہو سکتے ہیں، جس میں اعتماد کی کمی، دوسروں پر انحصار یا بعض اوقات جارحانہ اور انتقامی رویے شامل ہو سکتے ہیں۔"(۷)

کارل یونگ نے بچوں کے جنسی استحصال کے مسئلے کو زیادہ تر اجتماعی لاشعور اور اس سے جڑے اساطیری پہلوؤں کی روشنی میں دیکھا۔ وہ مانتے تھے کہ انسانی نفسیات میں بعض گہرے اور قدیم نمونے

(آرکی ٹائپس) موجود ہوتے ہیں جو ہمارے تجربات کو تشکیل دیتے ہیں۔ یونگ کے مطابق "جنسی استحصال جیسے واقعات کسی فرد کے لاشعور میں شدید زخم چھوڑ سکتے ہیں اور یہ زخم بعد میں زندگی میں مختلف نفسیاتی علامات، جیسے ڈپریشن، بے چینی اور اعتماد کی کمی کی صورت میں ظاہر ہو سکتے ہیں"۔ یونگ کے مطابق ان زخموں کا شفابخش عمل تبھی ممکن ہے جب فرد اپنے اندرونی نفسیاتی تضادات کو پہچانے اور ان کا سامنا کرے۔ مجموعی طور پر دیکھا جائے تو ان تینوں ماہرینِ نفسیات کے خیالات میں بنیادی فرق پایا جاتا ہے۔ فرائیڈ نے ابتدائی طور پر جنسی استحصال کو حقیقی مسئلہ سمجھا مگر بعد میں اسے نفسیاتی فینٹسی قرار دیا۔ ایڈلر نے اس کے سماجی اور نفسیاتی اثرات پر زور دیا جبکہ یونگ نے اسے اجتماعی لاشعور اور نفسیاتی ارتقا کے تناظر میں دیکھا۔

جدید نفسیات میں بچوں کے جنسی استحصال کو ایک سنگین مسئلہ سمجھا جاتا ہے اور تحقیق یہ ثابت کرتی ہے کہ اس کے اثرات متاثرہ افراد کی پوری زندگی پر مرتب ہو سکتے ہیں۔ ان تینوں نظریات کو سمجھنا اس لیے ضروری ہے تاکہ ہم بہتر طور پر جان سکیں کہ انسانی نفسیات پر ماضی کے صدمات کس طرح اثرانداز ہوتے ہیں اور ان کے تدارک کے لیے کون سے عملی اقدامات کیے جا سکتے ہیں۔

ج۔ اقوام متحدہ کا انسانی حقوق کے چارٹر اور آئین پاکستان میں استحصال حقوق کا بیانیہ:

اقوام متحدہ کا انسانی حقوق کے چارٹر اور آئین پاکستان میں استحصال حقوق کا بیانیہ بچوں کی ذہنی اور جسمانی استحصال کے متعلق نکات کا مطالعہ کیا جائے گا۔ اس کے ساتھ ساتھ بچوں کے معاشی استحصال اور چائلڈ لیبر کے متعلق اہم نکات کا جائزہ لیا جائے گا۔ اس چارٹر میں بچوں کی تعلیمی استحصال کے متعلق نکات اور جنسی استحصال کے متعلق نکات بھی اس کا حصہ ہوں گے۔ اس حوالے سے درج ذیل چار نکات اہم ہیں۔

ا۔ بچوں کے ذہنی و جسمانی استحصال کے متعلق نکات:

اقوام متحدہ انسانی حقوق کی حفاظت کے لیے مختلف طریقوں اور اقدامات کے ذریعے کام کرتی ہے۔ اس کا بنیادی مقصد دنیا بھر میں انسانی حقوق کو فروغ دینا، ان کی خلاف ورزیوں کو روکنا اور متاثرین کو انصاف فراہم کرنا

ہے۔ اقوام متحدہ کی انسانی حقوق کی حفاظت کی سرگرمیاں کئی جہتوں پر مشتمل ہیں، جن میں بین الاقوامی قوانین، نگرانی کے نظام، تحقیقات، آگاہی مہمات اور عملی اقدامات شامل ہیں۔ اقوام متحدہ نے انسانی حقوق کے تحفظ کے لیے کئی بین الاقوامی معاہدے تشکیل دیے ہیں۔ ان میں سب سے نمایاں عالمی منشور برائے انسانی حقوق ہے جو ۱۹۴۸ء میں منظور کیا گیا۔

یہ منشور دنیا بھر میں انسانی حقوق کے اصولوں کی بنیاد فراہم کرتا ہے۔ اس کے علاوہ اقوام متحدہ نے کئی قانونی معاہدے بھی وضع کیے ہیں، جیسے شہری اور سیاسی حقوق کا بین الاقوامی معاہدہ، معاشی، سماجی اور ثقافتی حقوق کا بین الاقوامی معاہدہ، بچوں کے حقوق کا کنونشن اور خواتین کے خلاف ہر قسم کے امتیازی سلوک کے خاتمے کا کنونشن۔ یہ معاہدے عالمی سطح پر حکومتوں کو انسانی حقوق کے تحفظ اور فروغ کے لیے پابند کرتے ہیں۔ اقوام متحدہ کے انسانی حقوق کے ہائی کمشنر کا دفتر انسانی حقوق کی نگرانی اور ان کی خلاف ورزیوں پر رپورٹنگ کا اہم ادارہ ہے۔

یہ دفتر دنیا بھر میں انسانی حقوق کی صورتحال پر تحقیق کرتا ہے، سالانہ رپورٹس تیار کرتا ہے اور اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی اور انسانی حقوق کونسل کو آگاہ کرتا ہے۔ اقوام متحدہ کی انسانی حقوق کونسل ایک اہم ادارہ ہے جو انسانی حقوق کی خلاف ورزیوں پر توجہ دیتا ہے۔ یہ کونسل مختلف ممالک میں انسانی حقوق کی صورتحال پر بحث کرتی ہے، تحقیقات کرواتی ہے اور سفارشات جاری کرتی ہے۔ اس کا ایک اہم طریقہ کار یونیورسل پیریاڈک ریویو ہے، جس کے تحت اقوام متحدہ کے تمام رکن ممالک کے انسانی حقوق کے ریکارڈ کا جائزہ لیا جاتا ہے۔

یہ مختلف ممالک اور موضوعات پر خصوصی نمائندے مقرر کرتی ہے جو مخصوص انسانی حقوق کی خلاف ورزیوں کی نگرانی کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر، ماورائے عدالت قتل، تشدد اور مذہبی آزادی جیسے موضوعات پر اقوام متحدہ کے خصوصی نمائندے مقرر کیے جاتے ہیں۔ اقوام متحدہ کے تحت عالمی عدالت انصاف اور بین الاقوامی فوجداری عدالت انسانی حقوق کی سنگین خلاف ورزیوں، جیسے نسل کشی، جنگی جرائم اور انسانیت کے خلاف جرائم پر کارروائی کرتی ہیں۔ یہ عدالتیں انسانی حقوق کی خلاف ورزی کرنے والوں کے خلاف قانونی کارروائی کر کے انصاف فراہم کرنے میں مدد دیتی ہیں۔ اقوام متحدہ کے امن مشنز دنیا کے ان علاقوں میں تعینات کیے جاتے ہیں جہاں انسانی حقوق کی خلاف ورزیوں کا خطرہ زیادہ ہوتا ہے۔ یہ مشنز متاثرہ

آبادی کو تحفظ فراہم کرتے ہیں اور حکومتوں کو انسانی حقوق کے اصولوں پر عمل کرنے کی تربیت دیتے ہیں۔ اقوام متحدہ مختلف آگاہی مہمات اور پروگرامز کے ذریعے انسانی حقوق کی اہمیت کو اجاگر کرتی ہے۔ یہ اقدامات عوامی شعور بیدار کرنے اور انسانی حقوق کے تحفظ کو یقینی بنانے میں مددگار ثابت ہوتے ہیں۔ اقوام متحدہ کا انسانی حقوق کے تحفظ میں کردار انتہائی وسیع اور متنوع ہے۔

یہ ادارہ قوانین، نگرانی، تحقیقات، تعلیم اور عملی اقدامات کے ذریعے دنیا بھر میں انسانی حقوق کو فروغ دینے کے لیے کوشاں ہے۔ تاہم اس مشن کی کامیابی کا انحصار رکن ممالک کے تعاون، مضبوط عدالتی نظام اور عالمی برادری کی مشترکہ کاوشوں پر ہے۔

اقوام متحدہ انسانی حقوق کی حفاظت کے لیے مختلف طریقوں اور اقدامات کے ذریعے کام کرتی ہے۔ اس کا بنیادی مقصد دنیا بھر میں انسانی حقوق کو فروغ دینا، ان کی خلاف ورزیوں کو روکنا اور متاثرین کو انصاف فراہم کرنا ہے۔ اقوام متحدہ کی انسانی حقوق کی حفاظت کی سرگرمیاں کئی جہتوں پر مشتمل ہیں، جن میں بین الاقوامی قوانین، نگرانی کے نظام، تحقیقات، آگاہی مہمات اور عملی اقدامات شامل ہیں۔ انھوں نے انسانی حقوق کے تحفظ کے لیے کئی بین الاقوامی معاہدے تشکیل دیے ہیں۔ ان میں سب سے نمایاں عالمی منشور برائے انسانی حقوق ہے، جو ۱۹۴۸ء میں منظور کیا گیا۔ یہ منشور دنیا بھر میں انسانی حقوق کے اُصولوں کی بنیاد فراہم کرتا ہے۔

اس کے علاوہ، اقوام متحدہ نے کئی قانونی معاہدے بھی وضع کیے ہیں، جیسے شہری اور سیاسی حقوق کا بین الاقوامی معاہدہ، معاشی، سماجی اور ثقافتی حقوق کا بین الاقوامی معاہدہ، بچوں کے حقوق کا کنونشن اور خواتین کے خلاف ہر قسم کے امتیازی سلوک کے خاتمے کا کنونشن۔ یہ معاہدے عالمی سطح پر حکومتوں کو انسانی حقوق کے تحفظ اور فروغ کے لیے پابند کرتے ہیں۔ اقوام متحدہ کے انسانی حقوق کے ہائی کمشنر کا دفتر انسانی حقوق کی نگرانی اور ان کی خلاف ورزیوں پر رپورٹنگ کا اہم ادارہ ہے۔ یہ دفتر دنیا بھر میں انسانی حقوق کی صورتحال پر تحقیق کرتا ہے، سالانہ رپورٹس تیار کرتا ہے اور اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی اور انسانی حقوق کونسل کو آگاہ کرتا ہے۔ اقوام متحدہ کی انسانی حقوق کونسل ایک اہم ادارہ ہے جو انسانی حقوق کی خلاف ورزیوں پر توجہ دیتا ہے۔

یہ کونسل مختلف ممالک میں انسانی حقوق کی صورتحال پر بحث کرتی ہے، تحقیقات کرواتی ہے اور سفارشات جاری کرتی ہے۔ اس کا ایک اہم طریقہ کار یونیورسل پیریاڈک ریویو ہے جس کے تحت اقوام متحدہ کے تمام رکن ممالک کے انسانی حقوق کے ریکارڈ کا جائزہ لیا جاتا ہے۔

اقوام متحدہ کے انسانی حقوق کے عالمی منشور (Universal Declaration of Human Rights) میں بچوں کے ذہنی اور جسمانی استحصال کے حوالے سے براہِ راست نکات شامل نہیں ہیں۔ تاہم اس منشور کی بعض دفعات تمام انسانوں، بشمول بچوں کے حقوق کی حفاظت پر زور دیتی ہیں۔

بچوں کے حقوق کے تحفظ کے لیے اقوام متحدہ نے ۱۹۸۹ء میں بچوں کے حقوق کا کنونشن (Convention on the Rights of the Child) منظور کیا جو بچوں کے خلاف ہر قسم کے استحصال کی ممانعت کرتا ہے۔ پاکستان نے بھی اس کنونشن کی توثیق کی ہے۔ اقوام متحدہ مختلف ممالک اور موضوعات پر خصوصی نمائندے مقرر کرتی ہے، جو مخصوص انسانی حقوق کی خلاف ورزیوں کی نگرانی کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر، ماورائے عدالت قتل، تشدد اور مذہبی آزادی جیسے موضوعات پر اقوام متحدہ کے خصوصی نمائندے مقرر کیے جاتے ہیں۔ اقوام متحدہ کے تحت عالمی عدالت انصاف اور بین الاقوامی فوجداری عدالت انسانی حقوق کی سنگین خلاف ورزیوں، جیسے نسل کشی، جنگی جرائم اور انسانیت کے خلاف جرائم پر کارروائی کرتی ہیں۔ یہ عدالتیں انسانی حقوق کی خلاف ورزی کرنے والوں کے خلاف قانونی کارروائی کر کے انصاف فراہم کرنے میں مدد دیتی ہیں۔

اقوام متحدہ کے امن مشنز دنیا کے ان علاقوں میں تعینات کیے جاتے ہیں جہاں انسانی حقوق کی خلاف ورزیوں کا خطرہ زیادہ ہوتا ہے۔ یہ مشنز متاثرہ آبادی کو تحفظ فراہم کرتے ہیں اور حکومتوں کو انسانی حقوق کے اصولوں پر عمل کرنے کی تربیت دیتے ہیں۔ اقوام متحدہ مختلف آگاہی مہمات اور تعلیمی پروگرامز کے ذریعے انسانی حقوق کی اہمیت کو اُجاگر کرتی ہے۔ یہ اقدامات عوامی شعور بیدار کرنے اور انسانی حقوق کے تحفظ کو یقینی بنانے میں مددگار ثابت ہوتے ہیں۔ انھوں نے بچوں کے حقوق کے کنونشن میں بچوں کے ذہنی اور جسمانی استحصال کے حوالے سے کئی شقیں شامل کی گئی ہیں تاکہ انہیں ہر قسم کے تشدد، بدسلوکی اور استحصال سے محفوظ رکھا جا سکے۔ اس کنونشن کے مطابق ہر بچے کو زندگی، تحفظ اور نشوونما کا حق حاصل ہے۔ کوئی بھی ریاست، ادارہ یا فرد کسی بچے کے ساتھ کسی قسم کی زیادتی یا استحصال نہیں کر سکتا۔ بچوں کو تشدد، جسمانی سزا اور غیر انسانی سلوک سے محفوظ رکھنے کے لیے قوانین کا نفاذ ضروری ہے۔

بچوں کے ساتھ جبری مشقت اور غلامی کے خلاف سخت اقدامات کیے گئے ہیں تاکہ انہیں کسی بھی ایسی سرگرمی میں شامل ہونے سے روکا جائے جو ان کی ذہنی یا جسمانی صحت کے لیے نقصان دہ ہو۔ اقوام متحدہ کا

کنونشن یہ بھی واضح کرتا ہے کہ بچوں کو کسی مسلح تنازعے میں بطور سپاہی بھرتی نہیں کیا جا سکتا اور نہ ہی انہیں کسی ایسی سرگرمی میں شامل کیا جا سکتا ہے جو ان کے تحفظ اور تعلیم کے حق کے خلاف ہو۔ بچوں کے استحصال میں شامل افراد، چاہے وہ والدین ہوں، سرپرست ہوں یا کوئی اور، ان کے خلاف قانونی کارروائی کا حق دیا گیا ہے۔

۲۔ بچوں کا معاشی استحصال اور جبری مشقت:

بچوں کا معاشی استحصال اور جبری مشقت ایک سنگین مسئلہ ہے جو دنیا بھر میں انسانی حقوق کی پامالی کا مظہر ہے۔ پاکستان جیسے ترقی پذیر ممالک میں چائلڈ لیبر ایک گہری جڑیں رکھنے والا مسئلہ ہے جو معاشی، سماجی، تعلیمی اور قانونی پہلوؤں کو متاثر کرتا ہے۔ یہ مضمون بچوں کے معاشی استحصال کے اسباب، اس کے نتائج، قانونی اقدامات اور اس کے تدارک کے ممکنہ حل پر تفصیلی روشنی ڈالے گا۔

پاکستان میں بچوں کے معاشی استحصال کے کئی بنیادی اسباب ہیں۔ غربت اور معاشی بدحالی چائلڈ لیبر کی سب سے بڑی وجہ ہے۔ کم آمدنی والے خاندان اپنے بچوں کو اسکول بھیجنے کے بجائے کام پر مجبور کرتے ہیں تاکہ وہ گھریلو اخراجات میں مدد کر سکیں۔ بہت سے دیہی علاقوں میں اسکولوں کی کمی اور تعلیمی نظام کی ناقص حالت کی وجہ سے بچے تعلیم حاصل کرنے سے محروم رہ جاتے ہیں اور محنت مزدوری پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ پاکستان میں چائلڈ لیبر کے خلاف کئی قوانین موجود ہیں لیکن ان کا مکمل نفاذ نہیں ہو پاتا جس کی وجہ سے بچوں کو جبری مشقت میں دھکیلا جاتا ہے۔

صنعتوں اور کاروباری اداروں میں سستی مزدوری کے لیے بچوں کا استحصال کیا جاتا ہے کیونکہ وہ کم اجرت پر زیادہ کام کرنے پر مجبور ہوتے ہیں۔ بعض خاندانوں میں بچوں کو کام پر بھیجنا ایک عام روایت سمجھی جاتی ہے اور یہ رویہ بچوں کے استحصال کو مزید بڑھاوا دیتا ہے۔ چائلڈ لیبر بچوں کی زندگی پر منفی اثرات مرتب کرتی ہے، جو ان کی جسمانی، ذہنی اور سماجی نشوونما کو متاثر کرتے ہیں۔ چائلڈ لیبر کے باعث بچے تعلیم سے محروم رہ جاتے ہیں، جس کی وجہ سے ان کے مستقبل کے مواقع محدود ہو جاتے ہیں۔ کم عمری میں زیادہ محنت کرنے سے بچوں کی جسمانی نشوونما متاثر ہوتی ہے اور وہ مختلف بیماریوں کا شکار ہو جاتے ہیں۔ کم عمری میں کام پر مجبور ہونے والے بچے اکثر مجرمانہ سرگرمیوں، نشے کی لعنت اور دیگر منفی رجحانات میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ چائلڈ لیبر

میں ملوث بچے تعلیم سے دور ہونے کی وجہ سے بعد میں بھی کم اجرت والی نوکریوں تک محدود رہتے ہیں جس سے غربت کا یہ چکر جاری رہتا ہے۔

پاکستان میں چائلڈ لیبر کے خاتمے کے لیے کئی قوانین اور اقدامات کیے گئے ہیں۔ چائلڈ لیبر ایکٹ ۱۹۹۱ء کے تحت ۱۴ سال سے کم عمر بچوں کو خطرناک کاموں میں لگانے پر پابندی عائد ہے۔ آئین پاکستان کی دفعہ -۱۱(۳) کے مطابق کسی بھی بچے سے جبری مشقت نہیں لی جاسکتی۔ تعلیم کا حق (دفعہ ۲۵-A) کے تحت پانچ سے سولہ سال کی عمر کے تمام بچوں کو مفت اور لازمی تعلیم کی فراہمی کی ضمانت دی گئی ہے۔ پنجاب پروہیبیشن آف چائلڈ لیبر ایکٹ ۲۰۱۶ء کے ذریعے گھریلو ملازمت میں بچوں کی ملازمت کو غیر قانونی قرار دیا گیا ہے۔ حکومت، سول سوسائٹی اور عوام کو مشترکہ کوششیں کرنی ہوں گی۔ حکومت کو چاہیے کہ وہ غریب خاندانوں کے لیے معاشی معاونت کے پروگرام شروع کرے تاکہ وہ اپنے بچوں کو تعلیم دلوانے کے قابل ہوں۔ تعلیم کو عام اور لازمی بنانے کے لیے مفت اسکول، وظائف اور دیگر سہولیات فراہم کی جائیں تاکہ زیادہ سے زیادہ بچے تعلیم حاصل کریں۔ اختر علی قریشی لکھتے ہیں:

> "چائلڈ لیبر ایک پیچیدہ مسئلہ ہے جو سماجی، اقتصادیاور قانونی پہلوؤں پر محیط ہے۔ پاکستان میں بچوں کے معاشی استحصال کے خاتمے کے لیے موثر قوانین موجود ہیں، لیکن ان پر مکمل عملدرآمد کی ضرورت ہے۔ اس مسئلے کے حل کے لیے حکومت، غیر سرکاری تنظیموں، میڈیااور عام عوام کو مل کر کام کرنا ہو گا تاکہ بچوں کو تعلیم اور محفوظ بچپن کا حق دیا جاسکے۔ اگر ہم آج کے بچوں کو تعلیم اور بہتر مواقع فراہم کریں گے، تو وہ کل کے روشن مستقبل کی ضمانت بنیں گے"۔(۸)

ان قوانین پر سختی سے عملدرآمد کرایا جائے اور ان کی خلاف ورزی کرنے والوں کو سخت سزائیں دی جائیں۔ میڈیا، تعلیمی اداروں اور دیگر ذرائع کے ذریعے چائلڈ لیبر کے نقصانات اور اس کے خلاف قوانین کے بارے میں عوام میں شعور اجاگر کیا جائے۔ کم آمدنی والے خاندانوں کے والدین کو ہنر مند بنانے اور بہتر روزگار کے مواقع فراہم کرنے کے لیے ٹریننگ سینٹرز قائم کیے جائیں تاکہ وہ اپنے بچوں کو محنت مزدوری پر مجبور نہ کریں۔

۳۔ بچوں کا تعلیمی استحصال:

پاکستان میں بچوں کا تعلیمی استحصال ایک اہم مسئلہ ہے جو کئی سماجی، اقتصادی اور قانونی عوامل کے تحت پروان چڑھتا ہے۔ آئینِ پاکستان بچوں کے تعلیمی حقوق کے تحفظ کے لیے کئی بنیادی نکات فراہم کرتا ہے، جن کا مقصد تمام بچوں کو مساوی تعلیمی مواقع فراہم کرنا اور انہیں جبری مشقت اور دیگر رکاوٹوں سے محفوظ رکھنا ہے۔

آئین کا آرٹیکل ۲۵-A ریاست کو پابند کرتا ہے کہ وہ پانچ سے سولہ سال کی عمر کے تمام بچوں کو مفت اور لازمی تعلیم فراہم کرے۔ اس کا مقصد تعلیم تک رسائی کو یقینی بنانا اور تعلیمی استحصال کو کم کرنا ہے۔ تاہم، پاکستان میں ابھی تک اس قانون پر مکمل طور پر عمل درآمد نہیں ہو سکا اور کئی بچے اسکول سے باہر ہیں۔ مفت اور لازمی تعلیم کی فراہمی کا قانونی ڈھانچہ موجود ہونے کے باوجود اس پر عملدرآمد کے لیے مزید پالیسی سازی اور نگرانی کی ضرورت ہے۔ ڈاکٹر شہزاد اقبال شام لکھتے ہیں:

> "آرٹیکل-۱۱ جبری مشقت کو ختم کرنے پر زور دیتا ہے اور اس کے تحت چودہ سال سے کم عمر بچوں کو کسی فیکٹری، کان یا خطرناک ملازمت میں کام کرنے سے روکا گیا ہے۔ مگر عملی طور پر دیہی اور شہری علاقوں میں بچے مزدوری کرتے دکھائی دیتے ہیں جس کی وجہ غربت اور قوانین پر عملدرآمد میں کمی ہے۔ حکومت نے اس سلسلے میں قوانین تو بنائے ہیں، مگر ان پر سختی سے عمل کرنے اور نگرانی کے مؤثر نظام کی ضرورت ہے"۔(۹)

پاکستان میں بچوں کا تعلیمی استحصال مختلف شکلوں میں موجود ہے۔ غربت کے باعث چائلڈ لیبر عام ہے جس کی وجہ سے بچے تعلیم سے محروم رہ جاتے ہیں۔ کئی پسماندہ علاقوں میں تعلیمی اداروں اور بنیادی سہولیات کی کمی بچوں کو تعلیم حاصل کرنے سے روکتی ہے۔ دیہی علاقوں میں لڑکیوں کی تعلیم کے حوالے سے کئی رکاوٹیں ہیں جن میں ثقافتی اور سماجی رویے شامل ہیں۔ اگرچہ آئینی ضمانتیں موجود ہیں، مگر ان پر مکمل عملدرآمد نہ ہونے کی وجہ سے تعلیمی عدم مساوات برقرار ہے۔

حکومت کو چاہیے کہ وہ آئین میں دیے گئے تعلیمی حقوق کے عملی نفاذ کو یقینی بنائے۔ قوانین کے مؤثر نفاذ، تعلیمی اداروں میں سہولیات کی بہتری، عوامی آگاہی اور غریب خاندانوں کے لیے مالی معاونت جیسے

اقدامات ضروری ہیں۔ تعلیمی وظائف اور مالی امداد کے ذریعے غریب خاندانوں کی مدد کی جاسکتی ہے تاکہ بچے اسکول چھوڑنے پر مجبور نہ ہوں۔ اگر ان نکات پر مؤثر عملدرآمد کیا جائے تو تعلیمی استحصال کے مسئلے کو کم کیا جا سکتا ہے اور بچوں کے تعلیمی حقوق کو محفوظ بنایا جاسکتا ہے۔

آرٹیکل ۳۷(b) اور (c) ریاست کو ذمہ دار ٹھہراتا ہے کہ وہ تعلیمی مواقع کو عام کرے اور ایسے اقدامات کرے جو بچوں کو تعلیمی استحصال سے بچائیں۔ اس میں خصوصی طور پر کمزور طبقے کے بچوں کے لیے تعلیمی سہولیات کی فراہمی پر زور دیا گیا ہے۔ تاہم، تعلیمی وسائل کی عدم دستیابی، اسکولوں کی کمی اور اساتذہ کی غیر موجودگی ان نکات پر مکمل عملدرآمد میں رکاوٹ ہیں۔ حکومت کو تعلیمی اداروں کی بہتری اور بنیادی سہولیات کی فراہمی کے لیے مزید اقدامات کرنے کی ضرورت ہے۔

اُردو کے افسانوی ادب میں بچوں کے تعلیمی استحصال کے موضوع کو گہرائی سے پیش کیا گیا ہے۔ کئی کہانیوں میں یہ دکھایا گیا ہے کہ کس طرح غربت، سماجی رویے اور حکومتی عدم توجہی بچوں کے تعلیمی سفر میں رکاوٹیں کھڑی کرتی ہیں۔ اُردو کے بڑے افسانہ نگاروں نے اپنے افسانوں میں ان بچوں کی محرومیوں اور خوابوں کی شکست کو بیان کیا ہے جو تعلیم حاصل کرنا چاہتے ہیں لیکن ان کے حالات انہیں اس راستے سے ہٹا دیتے ہیں۔ کئی کہانیوں میں مزدور بچوں کی تصویریں کھینچی گئی ہیں جو اسکول کی کتابوں کے بجائے اینٹوں کے بھٹے، ہوٹلوں اور کارخانوں میں کام کرنے پر مجبور ہیں۔ ان کے ہاتھوں میں قلم کے بجائے اوزار تھما دیے گئے ہیں اور علم کی روشنی تک رسائی ان کے لیے ایک خواب بن چکی ہے۔ بعض افسانے ان بچوں کے والدین کی بے بسی کو بیان کرتے ہیں، جو غربت کے ہاتھوں مجبور ہو کر اپنے بچوں کو تعلیم دینے کے بجائے انہیں کام پر بھیج دیتے ہیں۔

چند افسانے ایسے بھی ہیں جو دیہی علاقوں میں تعلیم کے فقدان پر روشنی ڈالتے ہیں۔ وہاں کے کرداروں میں وہ معصوم بچیاں شامل ہیں جن کے ہاتھوں میں کتابیں آنی تھیں، مگر وہ کم عمری میں شادی کے بندھن میں باندھ دی جاتی ہیں۔ تعلیم کے خواب ان کی آنکھوں میں ہی رہ جاتے ہیں اور وہ ایک ایسے نظام کا شکار ہو جاتی ہیں جو انہیں خود مختار بنانے کے بجائے پابند بنا دیتا ہے۔

اُردو افسانوی ادب میں ایسے اساتذہ کے کردار بھی دیکھنے کو ملتے ہیں جو بے سروسامانی کے باوجود علم کی روشنی پھیلانے کے لیے کوشاں رہتے ہیں۔ یہ کہانیاں اس معاشرتی حقیقت کو بے نقاب کرتی ہیں کہ صرف

قوانین کا ہونا کافی نہیں بلکہ ان پر عملدرآمد بھی ضروری ہے۔ بعض افسانے ان بچوں کی کامیابیوں کو بھی اجاگر کرتے ہیں جو تمام مشکلات کے باوجود اپنی تعلیم مکمل کرنے میں کامیاب ہوتے ہیں مگر ایسے کردار کم نظر آتے ہیں، کیونکہ حقیقت میں بھی یہ کامیابی کم ہی دیکھنے کو ملتی ہے۔ اُردو کے افسانہ نگاروں نے اپنے قلم کے ذریعے تعلیمی استحصال کے اس پہلو کو نہ صرف اجاگر کیا بلکہ قارئین کے ضمیر کو جھنجھوڑنے کی کوشش بھی کی ہے۔ ان کہانیوں میں دکھ، بے بسی، خوابوں کی کرچیاں اور ان خوابوں کی تعبیر کے لیے جدوجہد سب کچھ موجود ہے۔ یہ ادب محض کہانیاں نہیں بلکہ وہ آئینہ ہے جس میں ہم اپنے معاشرے کے ان بچوں کی تصویر دیکھ سکتے ہیں جو تعلیم کے حق سے محروم ہیں۔

۴۔ بچوں کے جنسی استحصال سے متعلق نکات:

آئین پاکستان بچوں کے بنیادی حقوق کے تحفظ کی ضمانت دیتا ہے جن میں ان کا جسمانی، ذہنی اور نفسیاتی تحفظ شامل ہے۔ بچوں کا جنسی استحصال ایک سنگین جرم ہے جو نہ صرف اخلاقی زوال کی عکاسی کرتا ہے بلکہ ایک ایسے سماجی المیے کی نشاندہی بھی کرتا ہے جو آئینی اور قانونی نکات کے باوجود برقرار ہے۔ ڈاکٹر شہزاد اقبال شام لکھتے ہیں:

> "آئین کے آرٹیکل ۲۵(۳) کے تحت ریاست کو یہ ذمہ داری سونپی گئی ہے کہ وہ بچوں کے حقوق کے تحفظ کو یقینی بنائے اور انہیں ہر قسم کے استحصال سے محفوظ رکھے۔ یہ شق بچوں کی مخصوص ضروریات کو مدنظر رکھتی ہے اور اس بات کی جانب اشارہ کرتی ہے کہ معاشرتی کمزوریوں کا شکار افراد، خاص طور پر بچے، خصوصی تحفظ کے مستحق ہیں"۔(۱۰)

پاکستان میں بچوں کے تحفظ کے لیے قانون سازی کی گئی ہے مگر یہ قوانین اس وقت تک مؤثر ثابت نہیں ہو سکتے جب تک ان کے نفاذ کو یقینی نہ بنایا جائے۔ فوجداری قانون میں ترمیم کے ذریعے بچوں کے خلاف جنسی جرائم کی سزائیں سخت کی گئی ہیں مگر اس کے باوجود یہ واقعات عام ہیں۔ آئینی ضمانتوں کے باوجود عدالتی نظام میں پیچیدگیاں، مقدمات کے طویل دورانیے اور سماجی دباؤ اکثر متاثرہ بچوں کو انصاف سے محروم کر دیتے ہیں۔ معاشرتی بیداری، تعلیمی اداروں میں حفاظتی تدابیر اور قانونی اداروں کی مستعدی کے بغیر بچوں کو جنسی استحصال سے محفوظ رکھنا مشکل ہے۔

آرٹیکل-۳۵ میں خاندان کے ادارے کو تحفظ فراہم کرنے کا ذکر کیا گیا ہے اور اس میں بچوں کی فلاح و بہبود کو بنیادی اہمیت دی گئی ہے۔ یہ اصول ریاست کو اس امر کا پابند بناتا ہے کہ وہ ہر بچے کے لیے محفوظ اور ساز گار ماحول فراہم کرے، جہاں وہ کسی بھی جسمانی، ذہنی یا جنسی استحصال سے آزاد ہو۔ تاہم، عملی طور پر سماجی ناانصافی، غربت اور قانونی عمل درآمد میں کمزوری کے باعث یہ مقصد مکمل طور پر حاصل نہیں کیا جاسکا۔

آرٹیکل-۱۱ جبری مشقت اور کم عمر بچوں کے استحصال کو ممنوع قرار دیتا ہے مگر یہی استحصال ایک اور خطرناک رخ اختیار کر لیتا ہے جب بچوں کو غیر محفوظ حالات میں کام پر مجبور کیا جاتا ہے اور وہ جنسی جرائم کا آسان ہدف بن جاتے ہیں۔ چائلڈ پروٹیکشن قوانین ہونے کے باوجود ان پر عملدرآمد کی کمزوری کے باعث بہت سے بچے ایسے عناصر کے ہاتھ چڑھ جاتے ہیں جو ان کی معصومیت کو پامال کر دیتے ہیں۔

آئین میں فراہم کردہ نکات اس امر کی نشاندہی کرتے ہیں کہ ریاست پر یہ لازم ہے کہ وہ نہ صرف سخت قوانین نافذ کرے بلکہ ان کے نفاذ کے لیے عملی اقدامات بھی کرے۔ ایک ایسا سماج جہاں بچے خود کو غیر محفوظ محسوس کریں، ترقی کی راہ پر آگے نہیں بڑھ سکتا۔ آئین کی روح اسی وقت مکمل ہو سکتی ہے جب ان قوانین کو حقیقی معنوں میں نافذ کیا جائے اور بچوں کے لیے ایک ایسا ماحول تخلیق کیا جائے جہاں وہ بلا خوف و خطر پروان چڑھ سکیں۔

اقوام متحدہ بچوں کے حقوق کے تحفظ کو عالمی سطح پر یقینی بنانے کے لیے مختلف معاہدات اور کنونشنز کے ذریعے ایک واضح اور جامع حکمت عملی فراہم کرتی ہے۔ بچوں کا جنسی استحصال ایک ایسا المیہ ہے جو معاشرتی زوال، اخلاقی کمزوری اور قانونی پیچیدگیوں کے سبب دنیا بھر میں ایک سنگین مسئلہ بنا ہوا ہے۔ اقوام متحدہ کے چارٹر اور اس کے زیر نگرانی نافذ کیے گئے معاہدے، بچوں کو اس اذیت ناک جرم سے محفوظ رکھنے کے لیے ریاستوں کو ان کے فرائض کی یاد دہانی کراتے ہیں۔

بچوں کے حقوق کے کنونشن (CRC) اقوام متحدہ کی وہ دستاویز ہے جو بچوں کے خلاف ہر قسم کے استحصال کو ممنوع قرار دیتی ہے۔ اس کنونشن کا آرٹیکل-۳۴ خصوصی طور پر اس امر کو اجاگر کرتا ہے کہ ریاستیں بچوں کو جنسی استحصال اور بدسلوکی سے محفوظ رکھنے کے لیے ضروری اقدامات کریں۔ یہ شق اس بات کو یقینی بناتی ہے کہ نہ صرف جسمانی بلکہ آن لائن اور دیگر جدید طریقوں سے ہونے والے استحصال کے خلاف بھی مؤثر حکمت عملی اپنائی جائے۔ اقوام متحدہ کے تحت بچوں کی جنسی تجارت اور جبری مشقت جیسے جرائم کی

روک تھام کے لیے اختیاری پروٹوکول بھی نافذ کیے گئے ہیں۔ ان معاہدوں کے مطابق ہر ریاست پر لازم ہے کہ وہ بچوں کے استحصال میں ملوث افراد کے خلاف سخت کارروائی کرے اور بین الاقوامی سطح پر بھی ایسے مجرموں کے خلاف تعاون کو یقینی بنائے۔

اقوام متحدہ کے پائیدار ترقی کے اہداف (SDGs) میں بھی بچوں کے تحفظ کو خصوصی اہمیت دی گئی ہے۔ ہدف ۱۶٫۲ بچوں پر ہر قسم کے تشدد کے خاتمے پر زور دیتا ہے جس میں جنسی استحصال کے خلاف اقدامات شامل ہیں۔ یہ ہدف ریاستوں کو پابند بناتا ہے کہ وہ نہ صرف قوانین کو سخت کریں بلکہ ان کے عملی نفاذ کو بھی یقینی بنائیں۔ ان تمام عالمی معاہدوں اور نکات کے باوجود، بچوں کے تحفظ کے خواب کو حقیقت میں بدلنا ایک مشکل امر ہے۔ قوانین صرف صفحات پر نہیں، بلکہ عملی زندگی میں نافذ ہونے چاہئیں۔ جہاں کہیں بھی کوئی بچہ استحصال کا شکار ہوتا ہے، وہاں انسانیت کا وقار مجروح ہوتا ہے۔ اس لیے اقوام متحدہ کے نکات پر مکمل عملدرآمد اور ان کی روح کے مطابق قوانین کی تشکیل ہی بچوں کے محفوظ مستقبل کی ضمانت بن سکتی ہے۔

حوالہ جات

۱۔ سعادت حسن منٹو، سیاہ حاشیے، سنگ میل پبلک کیشن لاہور، ۲۰۰۱ء، ص ۱۲۳

۲۔ اکبر رحمانی، اُردو میں ادب اطفال ایک جائزہ، علم و عرفان پبلکیشن لاہور، ۲۰۰۶ء، ص ۲۲۱

۳۔ شہزاد احمد، تین نفسیات دان، سنگ میل پبلیکیشن، لاہور، ۲۰۰۹ء، ص ۱۵۶

۴۔ رفیع اللہ، بچوں کا ادب اور تنقید کا المیہ، مشمولہ، ماہانہ ادبی لطیف، شمارہ ۷، دسمبر ۲۰۱۴ء، ص ۲۴۵

۵۔ شبیر سالک، برصغیر کے معاشی نظریات، الحمد للہ اکیڈمی لاہور، ۱۹۶۷ء، ص ۳۴۲

۶۔ رئیس امروہی، جنسیاتی مطالعے، مکتبہ دانیال لاہور، ۱۹۸۸ء، ص ۲۱۱

۷۔ شہزاد احمد، الفرڈ ایڈلر، سنگ میل پبلی کیشن، لاہور، ۱۹۹۸ء، ص ۱۹۸

۸۔ اختر علی قریشی، ائین پاکستان ۱۹۷۳ء، ندیم بک ہاؤس، لاہور، ص ۲۹۵

۹۔ ڈاکٹر شہزاد اقبال شام، دساتیر پاکستان کی اسلامی دفعات ایک تجزیاتی مطالعہ، شریعہ اکیڈمی اسلام آباد، ۲۰۱۸ء، ص ۴۳۴

۱۰۔ ڈاکٹر شہزاد اقبال شام، دساتیر پاکستان کی اسلامی دفعات ایک تجزیاتی مطالعہ، شریعہ اکیڈمی اسلام آباد، ۲۰۱۸ء، ص ۴۶۴

باب دوم:

معاصر اُردو افسانے میں بچوں کے ذہنی و جسمانی استحصال کی پیشکش

اُردو افسانے میں مجوزہ موضوع بچوں کے ذہنی و جسمانی استحصال کی پیشکش کی دو سطح پر اس کی وضاحت کی گئی ہے۔اس میں پہلی صورت جسمانی استحصال کے محرکات کا جائزہ لینا اور دوسری صورت بچوں کے ذہنی اور جسمانی استحصال کی صورتوں کو پیش کرنا ہے۔

مجوزہ موضوع کا تفصیل سے جائزہ لیا جائے تو معلوم ہو گا افسانے میں جدید نفسیات کا علم آنے کے ساتھ ایسے افسانوں کا اضافہ ہوا ہے جو بچوں کی نفسیات کو پیش کرتے ہیں۔اس حوالے سے مطالعہ کیا جائے تو ماضی میں منٹو، کرشن چندر پریم چند اور کئی افسانہ نگاروں نے بچوں کی نفسیات کو پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔عہدِ حاضر میں اُردو افسانہ میں بچوں کی ذہنی اور جسمانی استحصال پر متعدد افسانے لکھے گئے ہیں۔شعیب خالق، مریم مجید ڈاراور حمزہ حسن شیخ، جو کہ موثر اُردو افسانے کے نمائندہ افسانہ نگار ہیں انھوں نے بھی بچوں کے ذہنی اور جسمانی استحصال کو کئی سطحوں پر بیان کیا ہے۔جب کوئی تخلیق کار ایسے موضوعات کو بیان کرتا ہے تو اس میں سماجی، سیاسی اور معاشرتی حالات بھی کہانی کا جز بنتے ہیں کیونکہ انہی کے ذریعے ہی معاشرہ اس نہج تک پہنچتا ہے جہاں اہل عقل ان پر سوال اٹھاتے ہیں اور اس کے افعال و اعمال کی کارکردگی کو بیان کرتے ہیں۔

ا۔ معاصر اُردو افسانے میں بچوں کے ذہنی اور جسمانی استحصال کے محرکات:

جدید اُردو افسانے میں شعیب خالق انسانی نفسیات، سائنسی تخیل، معاشرتی مسائل اور سماجی تبدیلیوں کو نہایت باریک بینی سے بیان کرتا ہے، اس کی تحریروں میں نہ صرف کہانی کا تسلسل موجود ہوتا ہے بلکہ زبان کا جمالیاتی پہلو بھی نمایاں نظر آتا ہے۔بچوں کی نفسیات کے گہرے مطالعے کا ثبوت پیش کرنے والے افسانے عام بچوں سے مختلف نہیں ہوتے، لیکن وہ ان کے ذہنی اور جذباتی مسائل کو ایک منفرد انداز میں پیش کرتے ہیں۔بچوں کے خوف، ان کے خواب اور ان کے ارد گرد کے ماحول کا ان پر اثر، ان تحریروں میں ایک خاص اہمیت رکھتا ہے۔معصومیت اور ذہنی الجھنوں کو ایک ایسے انداز میں بیان کیا گیا ہے جو قارئین کو جذباتی سفر میں شریک کرتا ہے۔بالغ افراد کی نفسیاتی پیچیدگیوں کو بھی نہایت مہارت سے بیان کیا گیا ہے۔کردار اکثر کسی نہ

کسی ذہنی کشمکش سے گزرتے ہیں، جس میں داخلی تصادم، خوف، اضطراب اور مایوسی جیسے عناصر شامل ہوتے ہیں۔ اندرونی تضادات کو اس طرح اُبھارا گیا ہے کہ قاری خود بھی ان کے تجربات میں شامل محسوس کرتا ہے۔

سائنسی تخیل (سائنس فکشن) ایک اور اہم پہلو ہے۔ افسانوں میں مستقبل کے امکانات، نئی ایجادات اور ٹیکنالوجی کے انسانی زندگی پر اثرات کو نہایت تخلیقی انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ یہ تحریریں نہ صرف ایک تخیلاتی دنیا کی سیر کرواتی ہیں بلکہ اس کے ذریعے جدید سائنسی مسائل پر بھی روشنی ڈالتی ہیں۔ سائنسی ترقی اور انسانی اقدار کے درمیان توازن پر خاص توجہ دی گئی ہے۔ یہ افسانے محض ذاتی یا نفسیاتی سطح تک محدود نہیں، بلکہ وہ معاشرتی اور سماجی مسائل کو بھی نہایت حساسیت کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔ تحریریں سماج کی تلخ حقیقتوں، طبقاتی فرق، انسانی حقوق کی پامالی اور دیگر معاشرتی ناہمواریوں پر روشنی ڈالتی ہیں۔ کردار ہمارے معاشرے کے وہ لوگ ہوتے ہیں جو روزمرہ کی زندگی میں کئی چیلنجز سے نبرد آزما ہوتے ہیں۔ سلیم آغا قزلباش لکھتے ہیں:

> "جدید اُردو اسانی میں مغربی ادب کے تحت جو موضوعات اُردو افسانے میں وارد ہوئے ہیں سائنس فکشن اور نفسیاتی موضوعات ایسے ہیں جو اُردو افسانے میں ہر طرح سے برتے جارہے ہیں۔ جدید اُردو افسانے کو کلاسیکی افسانے سے انہی موضوعات کی بنا پر الگ کرسکتے ہیں۔ جدیدیت کی ان راہوں نے ہمارے فکشن کے بیانیے کو بھی متاثر کیا ہے"۔(۱)

اسلوب کی سب سے بڑی خصوصیت سادگی اور روانی میں ہے۔ مشکل الفاظ یا پیچیدہ جملے استعمال کیے بغیر ایک گہرا تاثر چھوڑنے میں کامیابی حاصل کی گئی ہے۔ زبان رواں، سادہ مگر بلیغ ہوتی ہے جس میں جذبات کی گہرائی اور خیال کی باریکی نمایاں ہوتی ہے۔ مکالمے، منظر نگاری اور بیانیہ کا ایسا حسین امتزاج ملتا ہے جو قاری کو کہانی کے ماحول میں جذب کر دیتا ہے۔ کہانی پن ایک مضبوط عنصر کے طور پر موجود رہتا ہے۔ کہانی کے بنیادی اُصولوں کو نظر انداز کیے بغیر موضوعاتی گہرائی کو برقرار رکھا گیا ہے۔ تحریروں میں ایک تسلسل پایا جاتا ہے جو ابتدا سے لے کر اختتام تک قاری کو باندھے رکھتا ہے۔ غیر ضروری طوالت سے گریز کرتے ہوئے مختصر مگر بامعنی بیانیہ پیش کیا جاتا ہے۔ یہ افسانہ نگاری جدید اُردو ادب میں ایک اہم سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔ افسانے نہ صرف فکری اور تخیلاتی سطح پر قاری کو متاثر کرتے ہیں بلکہ ان کی نفسیاتی اور سماجی بصیرت بھی نمایاں

ہوتی ہے۔ یہ تحریریں ہمیں انسانی ذہن، سائنسی امکانات اور معاشرتی مسائل پر ایک نیا زاویہ فراہم کرتی ہیں، جو انہیں جدید اُردو افسانے کے نمایاں ناموں میں شمار کرواتی ہیں۔

افسانہ "نامردگی" بچوں کے ذہنی اور جسمانی استحصال پر ایک گہری نظر ڈالنے والا بیانیہ ہے۔ اس میں کمزور اور معصوم بچوں پر ہونے والے تشدد، ان کی نفسیاتی اذیت اور سماج کی بے حسی کو نمایاں کیا گیا ہے۔ کہانی ایسے کرداروں کے گرد گھومتی ہے جو کسی نہ کسی طور پر ظلم اور جبر کا شکار ہوتے ہیں۔ بچوں کے ساتھ برتے جانے والے غیر انسانی سلوک اور ان کے احساسات کو نہایت باریک بینی سے اُجاگر کیا گیا ہے۔ یہ افسانہ اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ معاشرہ نہ صرف ان مسائل کو نظر انداز کرتا ہے بلکہ اکثر ان مظالم میں براہِ راست یا بالواسطہ شریک بھی ہوتا ہے۔ اس کا بیانیہ قاری کو جھنجھوڑنے اور سوچنے پر مجبور کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔

حمزہ حسن شیخ کے افسانے زندگی کے تلخ اور سفاک پہلوؤں کو بے نقاب کرتے ہیں، خاص طور پر وہ پہلو جو بچوں کے استحصال سے جڑے ہیں۔ چاکلیٹ، رحیموں کی ریڑھی اور اپنا اپنا جہنم تینوں افسانے کسی نہ کسی طرح بچوں کی معصومیت کے زیاں، ان کی محرومیوں اور معاشرتی بے حسی کی داستانیں ہیں۔ ان میں وہ سچائیاں پنہاں ہیں جو عام طور پر نظروں سے اوجھل رہتی ہیں یا جنھیں دیکھ کر بھی نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔

حمزہ حسن شیخ کے افسانے ترقی پسند ادب کی روایات سے جڑے ہوئے ہیں اور ان میں سماجی معاملات کو حقیقت پسندانہ انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ ترقی پسند تحریک نے ادب کو ایک ایسے آلے کے طور پر پیش کیا ہے جو نہ صرف زندگی کے تلخ حقائق کی عکاسی کرتا ہے بلکہ ان مسائل کو اجاگر کرنے میں بھی مدد دیتا ہے جو عام افراد کی زندگیوں پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ اس تناظر میں حمزہ حسن شیخ کے افسانے ایک مخصوص سماجی شعور کے ساتھ تخلیق کیے گئے ہیں، جہاں طبقاتی کشمکش، غربت، استحصال اور انسانی حقوق جیسے موضوعات نمایاں نظر آتے ہیں۔

ان کے افسانوں میں زندگی کے اصل مسائل کو دکھانے کی کوشش کی گئی ہے، جہاں کردار سماج کے اندر موجود جبر، نابرابری اور ناانصافی کا سامنا کرتے ہیں۔ ترقی پسند تحریک کے دیگر افسانہ نگاروں کی طرح، حمزہ حسن شیخ کے افسانے بھی عام آدمی کے دکھوں کو سمجھنے اور ان کے حق میں آواز بلند کرنے کا رجحان رکھتے ہیں۔ وہ ایک ایسی زبان اور طرزِ بیان اپناتے ہیں جو پیچیدہ استعارات یا مبہم علامات کے بجائے حقیقت کے قریب ہو، تاکہ قاری براہ راست ان مسائل کو محسوس کر سکے جو کہانی کے کردار بھگت رہے ہوتے ہیں۔ ترقی پسند ادب کی

بنیادی روح یہی تھی کہ ادب کو محض تخیل یا ذاتی جذبات کے اظہار تک محدود نہ رکھا جائے بلکہ اسے ایک سماجی تحریک کے طور پر استعمال کیا جائے۔ حمزہ حسن شیخ اس روایت کے امین نظر آتے ہیں، کیونکہ ان کے افسانے کسی نہ کسی سطح پر سماجی ناہمواریوں اور طبقاتی تقسیم کے خلاف احتجاج کی صورت اختیار کر لیتے ہیں۔ علی محمد صدیقی لکھتے ہیں:

> "ادب صرف تفریح کا ذریعہ نہیں، بلکہ سماج کے زخموں کا آئینہ بھی ہے۔ ترقی پسند ادب نے ان بچوں کی چیخیں سننے کی کوشش کی ہے جو گھروں، فیکٹریوں اور بازاروں میں استحصال کا شکار ہو رہے ہیں۔ ان کے ننھے ہاتھوں سے قلم چھین کر انہیں اوزار تھما دیے گئے، ان کے خواب چھین کر انہیں مزدوری پر لگا دیا گیا۔ جب کوئی افسانہ ان کی اذیت بیان کرتا ہے، تو یہ محض کہانی نہیں رہتی، بلکہ ایک احتجاج بن جاتی ہے—ایسا احتجاج جو سماج کے ضمیر کو جھنجھوڑنے کے لیے لکھا گیا ہو"۔(۲)

ان کے ہاں ترقی پسند ادب کے دیگر عناصر بھی واضح طور پر نظر آتے ہیں، جیسے عورتوں کے حقوق، جاگیر داری اور سرمایہ داری کے خلاف رد عمل اور عام آدمی کی جدوجہد۔ ان کے افسانوں میں عورتوں کے مسائل کو بھی ترقی پسند نقطۂ نظر سے دیکھا گیا ہے، جہاں عورت محض ایک روایتی کردار کے طور پر پیش نہیں کی جاتی بلکہ اسے ایک مکمل انسان کے طور پر دکھایا جاتا ہے، جو اپنی شناخت اور حقوق کے لیے برسرِ پیکار ہے۔

ترقی پسند تحریک کی روایات کے مطابق، حمزہ حسن شیخ کے افسانے نہ صرف حقیقت پسندی کے اُصولوں پر کاربند ہیں بلکہ ان میں مزاحمت کا عنصر بھی نمایاں نظر آتا ہے۔ وہ صرف سماج کے مسائل کی نشاندہی نہیں کرتے بلکہ ان کے ممکنہ حل کی طرف بھی اشارہ کرتے ہیں۔ یہی ترقی پسند ادب کی وہ بنیادی خوبی ہے جو اسے محض حقیقت نگاری سے بلند کر کے ایک فعال سماجی بیانیہ عطا کرتی ہے۔

ان کی تحریروں میں ترقی پسند تحریک کی زبان، طرزِ بیان اور بیانیہ کے وہ تمام بنیادی نکات موجود ہیں جو اس تحریک کے دیگر بڑے افسانہ نگاروں میں دیکھے جا سکتے ہیں۔ وہ حقیقت کو براہ راست پیش کرنے کے بجائے کہانی کے کرداروں، واقعات اور مکالموں کے ذریعے سماجی مسائل کو اس انداز میں پیش کرتے ہیں کہ قاری ان کے ساتھ جذباتی اور فکری طور پر جڑ جاتا ہے۔ ان کے افسانے ترقی پسند ادب کے اس اُصول کی پاسداری کرتے ہیں کہ ادب کا مقصد محض تفریح نہیں بلکہ سماجی شعور کو بیدار کرنا بھی ہے۔ اس حوالے سے

حمزہ حسن شیخ کی افسانہ نگاری کو ترقی پسند تحریک کے ایک تسلسل کے طور پر دیکھا جا سکتا ہے جو نہ صرف ماضی کی ترقی پسند روایات سے جڑی ہوئی ہے بلکہ جدید دور کے مسائل اور ان کے نئے تناظر کو بھی اپنے افسانوی بیانیے میں شامل کرتی ہے۔

چاکلیٹ میں ایک ایسا بچہ نظر آتا ہے جو محض ایک معمولی سی خواہش رکھتا ہے—چاکلیٹ کھانے کی۔ لیکن یہ خواہش اس کے لیے ایک ایسی آزمائش بن جاتی ہے جہاں اسے اپنی معصومیت کی قیمت چکانی پڑتی ہے۔ یہ افسانہ بچوں کے استحصال کے اس پہلو کو اُجاگر کرتا ہے جہاں ان کی معصوم خواہشات کو ان کے خلاف استعمال کیا جاتا ہے، انہیں لالچ میں پھنسایا جاتا ہے اور ان کے اعتماد کو توڑ کر انہیں ایک ایسے گھناؤنے دائرے میں دھکیل دیا جاتا ہے جہاں سے واپسی ممکن نہیں رہتی۔ یہ کہانی محض ایک فرد کے جُرم کی نشان دہی نہیں کرتی بلکہ اس پورے معاشرتی رویے کی عکاسی کرتی ہے جس میں بچے ایک کمزور شکار سمجھے جاتے ہیں اور ان کی ضروریات کو ایک ہتھیار بنا کر ان کا استحصال کیا جاتا ہے۔ شہزاد احمد لکھتے ہیں:

> "بنیادی طور پر کسی بچے کو بچہ کہنا بھی اس کی ہتک ہے۔ بچوں سے ایسے بات کرنا جیسے انہیں کسی بات کی سمجھ نہیں ہے یا وہ سمجھ نہیں سکتے تو بچوں کے ذہن میں ری ایکشن پیدا ہوتا ہے جو سب کانشیس کے مختلف حصّوں میں جمع ہوتا رہتا ہے۔ ہمارے سماجی رویے بنیادی طور پر اس تعلیم سے دور ہیں اور اپنی غلطیوں اور کوتاہیوں کی وجہ سے آنے والی نسل میں غلط اقدار کو پروان چڑھا رہے ہیں"۔(۳)

"رحیموں کی ریڑھی" ایک اور تلخ حقیقت کو آشکار کرتی ہے۔ یہاں کہانی ایک ایسے بچے کی ہے جو اپنی عمر کے بچوں کی طرح کھیلنے اور سیکھنے کے بجائے روزی روٹی کے لیے مزدوری پر مجبور ہے۔ اس کے کمزور ہاتھ جو کھلونوں سے کھیلنے کے لیے بنے تھے، وہ ایک بھاری ریڑھی کو دھکیلنے پر مجبور ہیں۔ اس کی خواہشیں، اس کے خواب سب غربت اور حالات کے بوجھ تلے دب جاتے ہیں۔ یہ کہانی صرف جسمانی محنت کی اذیت نہیں دکھاتی بلکہ اس دکھ کو بھی بیان کرتی ہے جو ایک کم سن بچہ سہتا ہے جب وہ وقت سے پہلے بڑے ہونے پر مجبور کر دیا جاتا ہے۔ اس میں وہ گہرا کرب شامل ہے جو ہر اس بچے کی زندگی کا حصّہ بن جاتا ہے جسے بچپن سے محروم کر دیا جاتا ہے اور جو اپنی خواہشوں کا گلا گھونٹ کر زندہ رہنے پر مجبور ہوتا ہے۔

"اپنا اپنا جہنم" ان بچوں کی کہانی ہے جو کسی نہ کسی طرح ظلم، زیادتی، تشدد یا نفسیاتی جبر کا شکار ہوتے ہیں۔ ہر ایک کا الگ الگ جہنم ہوتا ہے، مگر بچوں کے لیے سب سے بھیانک جہنم وہ ہوتا ہے جہاں ان کے جذبات کو کچلا جاتا ہے، ان کی شناخت مٹا دی جاتی ہے اور انہیں ایک ایسے ماحول میں دھکیل دیا جاتا ہے جہاں ان کے لیے کوئی سہارا نہیں ہوتا۔ یہ افسانہ نہ صرف بچوں کے جسمانی استحصال کی تصویر کشی کرتا ہے بلکہ اس خوفناک پہلو کو بھی سامنے لاتا ہے کہ کیسے ذہنی اور جذباتی استحصال ایک بچے کی پوری زندگی کو برباد کر سکتا ہے۔ وہ بچے جو ان حالات میں پرورش پاتے ہیں، وہ صرف اپنی مسکراہٹیں نہیں کھوتے بلکہ اکثر اپنی ذات کا شعور بھی کھو بیٹھتے ہیں۔ کال ینگ لکھتے ہیں:

> "انسانی دماغ مختلف واقعات کی صورتیں اپنے سب کانشیس میں محفوظ کر لیتا ہے لیکن بعض صورتوں میں اس کا اثر بچے پر منفی ہوتا ہے بلکہ وہ اپنی ذات کے احساس سے باہر نکل کر اس بے یقینی کی فضا کو محسوس کر لیتا ہے جو اس کے ارد گرد موجود ہوتی ہے یہی بے یقینی اس کے اندر کئی طرح کہ کمتری کے احساسات جنم لیتے ہیں جو اس کی ذات سے شروع ہو کر آگے بڑھتے رہتے ہیں۔ بچوں کے اندر ایسے ایسا ساتھ ان کی دماغی بڑھوتری پر اثر انداز ہوتے ہیں اور وہ آگے بڑھنے کی بجائے چند واقعات میں یوں الجھ کر رہ جاتے ہیں جس سے ان کے لیے چھٹکارا پانا ناممکن ہو جاتا ہے"۔(۴)

حمزہ حسن شیخ کے یہ افسانے سماج کے ان پہلوؤں کو بے نقاب کرتے ہیں جنہیں عام طور پر نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ یہ کہانیاں اس حقیقت کا بیان ہیں کہ کیسے کمزور اور بے سہارا بچے معاشرتی استحصال کا شکار بنتے ہیں اور وہ ظلم جو ان پر ہوتا ہے، اکثر خاموشی کے اندھیروں میں دفن ہو جاتا ہے۔ ان افسانوں میں صرف ایک کہانی نہیں بلکہ ایک مکمل منظر نامہ ہے جو ہر اس شخص کے سامنے آنا چاہیے جو خود کو انسانیت کا علمبردار سمجھتا ہے۔

مریم مجید ڈار کے افسانوی ادب میں جدید موضوعات کو ایک منفرد انداز میں پیش کیا گیا ہے، جہاں سماجی حقیقتوں کو نہایت حساس اور گہرے مشاہدے کے ساتھ بیان کیا جاتا ہے۔ ان کے افسانے بچوں کے ذہنی اور جسمانی استحصال جیسے اہم مسائل پر روشنی ڈالتے ہیں، جنہیں عمومی طور پر نظر انداز کر دیا جاتا ہے یا ان پر

کھل کر گفتگو نہیں کی جاتی۔ ان کے افسانے نہ صرف ایک کہانی سناتے ہیں بلکہ ان میں ایک ایسا تہہ در تہہ بیانیہ موجود ہوتا ہے جو قاری کو سوچنے اور سوال اٹھانے پر مجبور کر دیتا ہے۔

پیٹ ایک ایسا افسانہ ہے جو بچوں کے ذہنی و جسمانی استحصال کے ایک انتہائی تلخ پہلو کو اُجاگر کرتا ہے۔ کہانی میں ان معصوم وجودوں کو دکھایا گیا ہے جنہیں حالات، مجبوریوں اور بعض اوقات سماجی بے حسی کے باعث ایک خوفناک کاروبار کا حصّہ بنا دیا جاتا ہے۔ پیٹ صرف ایک استعارہ نہیں بلکہ ایک سچائی ہے جو مختلف صورتوں میں موجود رہتی ہے۔ اس کہانی میں نہ صرف ظلم کی شدت بیان کی گئی ہے بلکہ اس کے پیچھے موجود وہ پورا نظام بھی دکھایا گیا ہے جو استحصال کو جنم دیتا ہے اور پھر اسے برقرار رکھتا ہے۔ افسانے کا انداز ایسا ہے کہ قاری کو محض ایک منظر نامہ نہیں دکھایا جاتا بلکہ اسے اس المیے کا براہ راست حصہ بنا دیا جاتا ہے۔

اس سلسلے میں مریم مجید ڈار کے افسانے "پیٹ" سے اقتباس ملاحظہ ہو:

> "اس کی ماں کو بس ایک ہی فکر لاحق رہتی کہ کہیں وہ گھسٹتی ہوئی فٹ پاتھ سے سڑک پر نہ اتر آئے اور کسی گاڑی کے پہیے سے چپک کر فرار ہو جائے، لہٰذا اس نے نائیلون کی سبز ڈوری سے اس کی پولیوزدہ ٹانگ کو لیمپ پوسٹ کے ساتھ باندھنا شروع کر دیا اور فریاد کی اثر پزیری میں تیس فیصد اضافہ ہو گیا"۔(۵)

حمزہ حسن شیخ کے افسانوں پر مشتمل کتاب "قیدی" کے افسانے "خودکشی" میں بھی یہی بات بیان کی گئی ہے کہ دنیا میں ہر ایک مخلوق اپنی خودکشی کی جانب سفر کر رہی ہے حتیٰ کہ انسان ہی انسان کے ہاتھوں سے خودکشی کا شکار ہو رہا ہے۔ کیڑے مکوڑے جو کہ انسان کے مردہ جسم کو کھاتے ہیں آپس میں گفتگو کرتے ہیں کہ کہ اگر انسان ہی انسان کو کھانا شروع کر دے گا تو پھر ہمارے لیے کیا بچے گا۔ انسان اتنے وحشی ہو چکے ہیں کہ وہ ایک دوسرے کے گوشت کے عادی بن چکے ہیں:

> "کیا تم نے کوئی خبر سُنی کہ زمین پر کیا ہو رہا ہے؟ ایک کیڑے نے خوفزدہ ہو کر دوسرے سے پوچھا۔ ہاں، میں تو یہ جان کر حیران ہوں کہ انسان ایک دوسرے کو کھا رہے ہیں"۔
>
> دوسرے نے جواب دیا۔
>
> وہ بہت ظالم ہیں، ایک دوسرے کو لوہے سے نوچ کے کیسے کھاتے ہیں؟" پہلے نے دوسرے کو جواب دیا۔

"یہ بہت اذیت ناک بات ہے کہ وہ بھی اپنا پیٹ بھرنے کے لیے ہماری جیسی عادات اپناتے جارہے ہیں۔ پہلے وہ مجھے بہت دیو قامت اور بھاری بھر کم دکھائی دیتے تھے مگر اب اپنے برابر نظر آتے ہیں"۔(۶)

اس پیراگراف سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ انسان اس حد تک پہنچ گیا ہے کہ جو کام کیڑے مکوڑے کرتے ہیں، وہ بھی کرنے کا عادی ہو گیا ہے اور اس مخلوق کو انسان پر شک ہونے لگا ہے کہ کہیں وہ اس حد تک ہی نہ پہنچ جائے کہ ہم سے ہی کوئی بدلہ لینا شروع کر دے۔

اس حوالے سے نیلم احمد بشیر مریم مجید کے افسانوں پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتی ہیں:

"مریم مجید کی اس کتاب میں موجود افسانہ چھوٹا گوشت ہماری سماج کی ایسی تصویر کو سامنے لاتا ہے جو اپنے اندر کئی سوالوں کو جذب کیے ہوئے ہیں یہ صرف استعارہ نہیں ہے بلکہ سماجی صورت گری کی بے مثال تصویر ہے۔ اس افسانے کی اہم خصوصیت اس کا منجمد ہونا ہے جو اپنے واقعے اور قضیے میں ٹھہری ہوئی تصویر کی طرح نظر آتا ہے"۔(۷)

"پرایا ہاتھ" ایک اور ایسا افسانہ ہے جو بچوں کے ساتھ ہونے والے ذہنی اور نفسیاتی استحصال کی ایک انتہائی گہری تصویر کشی کرتا ہے۔ کہانی ایک ایسے بچے کے گرد گھومتی ہے جو ایک انجانے خوف میں جیتا ہے، ایک ایسا خوف جو اس کے ذہن پر چھایا رہتا ہے اور جسے وہ الفاظ میں بیان نہیں کر سکتا۔ اس افسانے میں وہ خاموش اذیت دکھائی گئی ہے جو بچے اندر ہی اندر سہتے ہیں، مگر جنہیں سمجھنے والا کوئی نہیں ہوتا۔ قاری کہانی کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے اس درد کو محسوس کرتا ہے جو بچے کی معصومیت اور بے بسی میں لپٹا ہوا ہے۔ یہ کہانی اس اہم حقیقت کی نشان دہی کرتی ہے کہ ظلم صرف جسمانی تشدد کی صورت میں نہیں ہوتا بلکہ بعض اوقات ایک ایسا مسلسل دباؤ اور جبر بھی ہوتا ہے جو کسی آواز یا نشان کے بغیر بھی ایک زندگی کو متاثر کر سکتا ہے۔

اُردو ادب میں بچوں کے تحفظ سے متعلق نظریات براہ راست یا بالواسطہ طور پر مختلف ادبی متون میں جھلکتے ہیں۔ یہ نظریات بچوں کے ذہنی، جسمانی اور سماجی مسائل کی نشاندہی کرتے ہیں اور ان کے استحصال کو روکنے کے اصول وضع کرتے ہیں۔ ترقی پسند ادب ہو یا جدیدیت کے زیرِ اثر لکھی گئی کہانیاں، ان میں بچوں کی زندگی کے مختلف پہلوؤں کو اُجاگر کیا گیا ہے، جن میں ان کی نفسیاتی تشکیل، سماجی ناہمواریوں سے ان کا تعلق اور تحفظ کی ضرورت جیسے مسائل شامل ہیں۔ بچوں کی ترقیاتی نفسیات کا نظریہ اس بات پر زور دیتا ہے کہ ان کی

ابتدائی پرورش اور ماحول ان کی شخصیت کی تشکیل میں بنیادی کردار ادا کرتا ہے۔ اُردو افسانے میں ایسے کردار ملتے ہیں جو اپنی معصومیت برقرار رکھنے میں ناکام رہتے ہیں کیونکہ انہیں کم عمری میں ہی سخت حقیقتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ بہت سے افسانوں میں بچے بڑے ہوتے ہی احساس کمتری کا شکار ہو جاتے ہیں یا ان کے اندر بغاوت پنپنے لگتی ہے، جس کا نتیجہ انہیں یا تو انتہا پسند سوچ کی طرف لے جاتا ہے یا وہ مکمل طور پر انفعالیت میں چلے جاتے ہیں۔

اسی طرح ماحولیاتی اثرات کا نظریہ یہ بتاتا ہے کہ بچوں پر ان کے گھر، اسکول، محلہ اور وسیع تر سماجی ماحول کے کیا اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ اُردو ادب میں ہمیں وہ کہانیاں ملتی ہیں جہاں بچے خاندانی ناانصافیوں اور طبقاتی تقسیم کے سبب خود کو بے یار و مددگار محسوس کرتے ہیں۔ ان کے خواب، خواہشات اور جذباتی تقاضے دب جاتے ہیں کیونکہ ان کے اردگرد کا ماحول ان کے لیے امکانات کے دروازے بند کر دیتا ہے۔ بعض افسانوں میں ان بچوں کی تصویر کشی کی گئی ہے جو امیر گھروں میں ملازم کے طور پر کام کرتے ہیں اور وہاں ان کے ساتھ روا رکھا جانے والا سلوک انہیں ایک کمتر انسان بنا دیتا ہے۔

"اٹیچمنٹ تھیوری" ہمیں یہ بتاتی ہے کہ والدین اور قریبی رشتہ داروں کے ساتھ بچے کے تعلقات اس کی ذہنی نشوونما پر گہرے اثرات ڈالتے ہیں۔ اُردو افسانے میں اکثر ایسے بچے نظر آتے ہیں جو محبت کی کمی کے باعث کسی بڑے جذباتی بحران کا شکار ہو جاتے ہیں۔ بعض اوقات والدین کی سختی یا لاپروائی ان میں اعتماد کی کمی پیدا کر دیتی ہے جو انہیں پوری زندگی مختلف سطحوں پر متاثر کرتی ہے۔

بچوں کے حقوق کا نظریہ اس امر کی وضاحت کرتا ہے کہ تعلیم، کھیل اور اظہارِ رائے ان کے بنیادی حقوق میں شامل ہیں مگر اُردو ادب میں ہمیں مسلسل ایسے کردار ملتے ہیں جنھیں ان حقوق سے محروم رکھا گیا۔ خاص طور پر ترقی پسند افسانوں میں یہ دکھایا گیا ہے کہ مزدور بچوں کو بنیادی ضروریات تک میسر نہیں اور وہ اپنے بچپن سے ہی مشقت کی چکی میں پس جاتے ہیں۔ ایسے کردار زندگی میں آگے بڑھنے کے مواقع سے محروم رہتے ہیں اور سماجی عدم مساوات کا شکار ہو کر اپنی پوری زندگی کے خواب کھو بیٹھتے ہیں۔

نفسیاتی استحصال کا نظریہ ہمیں اس بات کی وضاحت دیتا ہے کہ جذباتی دباؤ اور مسلسل ذہنی تناؤ بچوں کی شخصیت کو مسخ کر سکتا ہے۔ اُردو کہانیوں میں بعض اوقات ایسے بچے ملتے ہیں جو اپنے والدین، اساتذہ یا دیگر سماجی عناصر کے ہاتھوں مسلسل سخت رویے کا سامنا کرتے ہیں۔ ان کے اندر یا تو خوف بیٹھ جاتا ہے یا وہ شدید

غصے اور انتقام کے جذبات کے ساتھ بڑے ہوتے ہیں۔ یہ نفسیاتی دباؤ انہیں ایسے راستوں پر دھکیل دیتا ہے جہاں وہ اپنی شناخت اور زندگی کے مقاصد کے حوالے سے الجھنوں کا شکار ہو جاتے ہیں۔

تحفظِ اطفال کی تھیوری بچوں کو استحصال سے بچانے کے لیے قانونی، سماجی اور اخلاقی اُصولوں کی وضاحت کرتی ہے۔ اُردو ادب میں ایسے کردار دیکھنے کو ملتے ہیں جو اگرچہ اپنی حفاظت کے اہل نہیں ہوتے مگر ان کی دیکھ بھال کرنے والے افراد انہیں مزید مشکلات میں ڈال دیتے ہیں۔ خاص طور پر خواتین مصنفین نے ایسے کردار تخلیق کیے ہیں جو گھروں میں کام کرنے والی کم عمر لڑکیوں کے استحصال کو نمایاں کرتے ہیں۔ یہ کردار ان تمام سماجی روّیوں کو آشکار کرتے ہیں جو بچوں کے حقوق کی خلاف ورزی کا سبب بنتے ہیں۔ ان تمام نظریات کی روشنی میں اُردو ادب کو دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ نہ صرف بچوں کے مسائل کی نشان دہی کرتا ہے بلکہ ان کے حل کے لیے بھی ایک فکری بنیاد فراہم کرتا ہے۔ اُردو کہانیاں اور ناول ان مسائل کو معاشرتی، نفسیاتی اور طبقاتی حوالوں سے بیان کرتے ہوئے بچوں کے حقوق اور ان کے تحفظ کے بارے میں ایک سنجیدہ مکالمہ تخلیق کرتے ہیں۔

یہ دونوں افسانے سماج میں موجود اس تاریک پہلو کو روشنی میں لاتے ہیں جہاں بچوں کو تحفظ دینے کی بجائے ان پر جبر کیا جاتا ہے۔ مریم مجید ڈار نے ان کہانیوں میں ایک ایسا ماحول تخلیق کیا ہے جو قاری کو صرف جذباتی نہیں کرتا بلکہ اسے غور و فکر پر بھی مجبور کرتا ہے۔ بچوں کے خلاف ہونے والے جرائم کے پیچھے موجود نفسیاتی اور سماجی وجوہات کو یہ کہانیاں نہایت باریکی سے پیش کرتی ہیں، جہاں صرف مظلوم اور ظالم کے کردار ہی نہیں بلکہ ایک پورا معاشرتی ڈھانچہ نظر آتا ہے جو کسی نہ کسی صورت اس استحصال کو تقویت دیتا ہے۔

> "کئی بار بخشش دینے والوں کا دامن میلے کچیلے ہاتھوں سے تھامنے پر خود بھی لات کھاتے اور ماں کا دھندا بھی ماٹھا کرتے مر جاو منحوسو! کمبختو!" وہ انہیں دو دو دھموکے رسید کر کے اپنی سب سے پر اثر فریاد، یعنی اسے سامنے لٹا لیتی اور دے جا سخیا۔" کے کھوٹے سکے فٹ پاتھ سے سڑک تک بکھر کے گول گول گھومنے لگتے اور ماں تیز رفتار گاڑیوں اور ٹریفک کے پاگل ہجوم میں کسی اندھے سپاہی کی طرح بھاگتی ہوئی ان سکوں کا پیچھا کرتی رہتی۔ زندگی، سکے، روٹی، دائرے، وہ سب اس گول چکر سے کبھی نکل ہی نہ پاتے تھے۔ صبح سے شام اور شام سے پھر صبح تک دائرے میں بھاگنے والے زندہ اور متنفس تماشے"۔(۸)

حمزہ حسن شیخ کے افسانے "روٹی" میں جس طرح انسانی مصائب و پریشانیوں کا ذکر کیا گیا ہے وہ ہمارے معاشرے کا ایک ایسا المیہ ہے کہ جس پر پورے معاشرے کو غور کرنے کی ضرورت ہے۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ انسان روٹی کے لیے جتنی تکالیف برداشت کرتا ہے وہ اس کی زندگی کا ایک بہت بڑا مسئلہ بن جاتا ہے۔ درجِ ذیل اقتباس پر اگر غور کیا جائے تو ہمارے سامنے جو تصور اُبھرتا ہے وہ کچھ یوں ہے:

"پادری کبھی بھی ایک روپیہ کمانے کے قابل نہیں تھا جب تک کہ گاؤں میں کوئی پیدائش یا موت واقع نہ ہوتی۔ اگرچہ پیدائش خوشی کا معاملہ تھا لیکن موت ہمیشہ ہی اپنے ساتھ دُکھ اور غم کا پیغام لاتی۔ اُنہوں نے بھی بھی ایک دوسرے کے لیے موت کی خواہش نہیں کی تھی لیکن اگر گاؤں میں کوئی موت واقع نہ ہوتی تو پادری فاقہ کشی پر مجبور تھا۔ پورے گاؤں کے واحد گورکن کا قبر میں کھودنے کے علاوہ کوئی کام نہیں تھا اور اُس کی روٹی مرنے والے لوگوں کی تعداد پر منحصر تھی۔ اگر وہاں پر کوئی موت واقع نہ ہوتی تو اُس کا پیٹ بھرنے کے لیے کوئی روٹی نہ ہوتی۔ اگرچہ اس نے کبھی بھی کسی کی موت کی دُعا نہیں کی تھی لیکن کوئی موت واقع نہ ہونے کی صورت میں اُس کو کئی دن تک فاقے کرنے پڑتے"۔(۹)

اگرچہ یہ کہانی ہمارے سماجی رویوں کی ایک المناک داستان ہے مگر پھر بھی ہر کوئی اس حقیقت کو ماننے کے لیے تیار نہیں ہے۔ انھی سماجی روّیوں پر بات کرتے ہوئے جمیل احمد عدیل لکھتے ہیں:

"ہمارے سماجی رویے انہی واقعات سے سامنے آتے ہیں اور ایک ایسے سماج کا نقشہ پیش کرتے ہیں جو ظالم اور مظلوم کی داستان کو بیان کر رہا ہے۔ ادب میں ان روّیوں کو تخلیقی فن پاروں میں ممکنہ محرکات اور وجوہات کے ساتھ بیان کیا جا چکا ہے، اصل واقعات کہیں سماجی جڑوں میں پیوست ہیں جن کو نئے سرے سے سامنے لانے کی ضرورت ہے"۔(۱۰)

یہ کہانیاں اس بات کی بھی غمازی کرتی ہیں کہ استحصال کا مسئلہ محض انفرادی سطح کا نہیں بلکہ ایک اجتماعی معاملہ ہے جس پر بات کرنا اور اسے ختم کرنے کے لیے عملی اقدامات اُٹھانا انتہائی ضروری ہے۔ بچوں کے ذہنی اور جسمانی استحصال کے خلاف ادبی بیانیہ نہ صرف شعور اُجاگر کرنے میں مددگار ثابت ہو سکتا ہے بلکہ

ایک بڑی سماجی تبدیلی کا پیش خیمہ بھی بن سکتا ہے۔ مریم مجید ڈار کی یہ تحریریں اُردو ادب میں اس اہم موضوع پر ایک سنجیدہ مکالمے کو فروغ دینے کی کوشش ہیں جو سماج کے ہر فرد کو یہ سوچنے پر مجبور کرتی ہیں کہ وہ ان بچوں کے لیے کیا کر سکتا ہے جو اس بے رحم دنیا میں اپنی معصومیت کے ساتھ کھڑے ہیں۔

اُردو ادب میں ذہنی استحصال کی مختلف صورتیں نمایاں طور پر نظر آتی ہیں، جہاں کرداروں کے نفسیاتی کرب، داخلی کشمکش اور سماجی جبر کو ادبی پیرائے میں پیش کیا گیا ہے۔ یہ استحصال مختلف شکلوں میں ظاہر ہوتا ہے، جن میں خاندان، سماج، تعلیمی نظام اور معاشرتی رویے اہم کردار ادا کرتے ہیں۔

بچوں کے ذہنی استحصال کی ایک نمایاں صورت ان پر مسلط کی جانے والی سخت روایات اور غیر ضروری سماجی پابندیاں ہیں۔ اُردو ادب میں ایسے کردار ملتے ہیں جو اپنی معصومیت میں وہ بوجھ اٹھاتے ہیں جو ان کی عمر اور ذہنی سطح سے کہیں زیادہ ہوتا ہے۔ یہ استحصال والدین اور سرپرستوں کی جانب سے غیر ضروری توقعات، جذباتی بے حسی اور سخت روایتی رویوں کے باعث شدت اختیار کر لیتا ہے جس کے نتیجے میں بچے اپنی ذات کی شناخت کھو دیتے ہیں اور ان میں احساسِ کمتری اور خوف پروان چڑھتا ہے۔

دوسری صورت تعلیمی اور سماجی دباؤ کی ہے، جہاں بچوں کو ایک مخصوص سانچے میں ڈھالنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اُردو ادب میں کئی ایسے کردار نظر آتے ہیں جو اپنی فطری صلاحیتوں کو کھونے پر مجبور کر دیے جاتے ہیں کیونکہ معاشرہ انہیں وہی بنانا چاہتا ہے جو اس کے مطابق کامیابی کی علامت ہو۔ یہ روّیہ بچوں کی شخصیت میں عدم اعتماد پیدا کرتا ہے اور انہیں تخلیقی طور پر اپاہج بنا دیتا ہے۔

خاندانی جبر بھی ذہنی استحصال کی ایک صورت ہے، جہاں بچوں کے جذبات، خواہشات اور خوابوں کو دبایا جاتا ہے۔ اُردو افسانوں میں ایسے بچے اکثر نظر آتے ہیں جو محبت اور اپنائیت کی تلاش میں سرگرداں رہتے ہیں، لیکن انہیں سختی، بے اعتنائی یا جذباتی استحصال کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ ایسے بچے بڑے ہو کر یا تو بغاوت کی راہ اختیار کر لیتے ہیں یا پھر ایک مستقل احساسِ جرم اور محرومی کے ساتھ زندگی گزارتے ہیں۔

معاشی دباؤ بھی ذہنی استحصال کی ایک شکل ہے جو اُردو افسانے میں اکثر ان بچوں کے ذریعے ظاہر ہوتا ہے جو کم عمری میں محنت مزدوری کرنے پر مجبور ہوتے ہیں۔ ان کی ذہنی نشوونما اس وقت متاثر ہوتی ہے جب وہ کھیلنے، سیکھنے اور زندگی کے عام تجربات حاصل کرنے کی عمر میں بھوک، غربت اور ذلت کے سائے میں جینے پر مجبور ہوتے ہیں۔ اُردو ادب میں ایسے کردار حقیقت پسندی اور گہرے جذباتی کرب کے ساتھ پیش کیے گئے

ہیں جو اس تلخ حقیقت کی عکاسی کرتے ہیں کہ غربت صرف جسمانی مشقت نہیں بلکہ ذہنی اذیت بھی ہے۔ ان تمام صورتوں میں ذہنی استحصال نہ صرف ایک فرد کی زندگی پر اثر انداز ہوتا ہے بلکہ پورے سماج کی فکری اور اخلاقی بنیادوں کو ہلا کر رکھ دیتا ہے۔ اُردو ادب میں ان موضوعات پر لکھا جانا دراصل سماجی شعور کو جھنجھوڑنے کی ایک کوشش ہے تاکہ ایک ایسا معاشرہ تشکیل دیا جاسکے جہاں ذہنی اذیت کو نظر انداز نہ کیا جائے بلکہ اسے سنجیدگی سے سمجھا اور ختم کیا جائے۔

محرکات:

۱۔ بچوں کے مسائل کو اکثر کم اہمیت دی جاتی ہے۔ والدین، اساتذہ اور دیگر افراد ان کی ذہنی اور جسمانی کیفیت کو نظر انداز کر دیتے ہیں جس کے نتیجے میں ان کے مسائل شدت اختیار کر جاتے ہیں۔ جب بچوں کی تکالیف کو سنجیدگی سے نہیں لیا جاتا تو وہ مدد مانگنے کے قابل نہیں رہتے اور نہ ہی کسی پر اعتماد کر پاتے ہیں۔

۲۔ مالی مسائل کے باعث والدین اکثر بچوں کو مزدوری پر لگا دیتے ہیں جہاں وہ کم اجرت پر سخت مشقت کرتے ہیں اور جسمانی و نفسیاتی تشدد کا نشانہ بنتے ہیں۔ تعلیمی اخراجات پورے نہ ہونے کی وجہ سے کئی والدین بچوں کی تعلیم کے بجائے ان سے کمائی کرانے کو ترجیح دیتے ہیں جو ان کے استحصال کا سبب بنتا ہے۔ کچھ گھروں میں بچوں پر غیر ضروری دباؤ ڈالا جاتا ہے جہاں ان کی مرضی اور جذبات کو نظر انداز کر کے انہیں والدین یا دیگر افراد کی خواہشات کے مطابق زندگی گزارنے پر مجبور کیا جاتا ہے۔ مسلسل جبر اور سخت رویہ ان کی ذہنی صحت پر منفی اثرات مرتب کرتا ہے جس کی وجہ سے وہ نفسیاتی مسائل کا شکار ہو جاتے ہیں۔

۳۔ کچھ سکولوں اور مدرسوں میں بچوں کے ساتھ سخت سلوک کیا جاتا ہے جہاں اساتذہ کی جانب سے جسمانی تشدد یا تحقیر کا سامنا رہتا ہے۔ ایسے اداروں میں سیکھنے کا ماحول خوف زدہ بنا دیا جاتا ہے جس کی وجہ سے بچے ذہنی دباؤ میں مبتلا ہو جاتے ہیں اور ان کا تعلیمی سفر متاثر ہوتا ہے۔

۴۔ ایسے گھر جہاں والدین کے درمیان لڑائی جھگڑے معمول بن چکے ہوں وہاں بچے براہ راست یا بالواسطہ طور پر متاثر ہوتے ہیں۔ اگر والدین بچوں کے ساتھ سختی برتتے ہیں تو اس سے ان کی ذہنی

نشوونما بری طرح متاثر ہوتی ہے۔ ایسے بچے خوفزدہ، عدم تحفظ کا شکار اور چڑچڑے مزاج کے ہو جاتے ہیں۔

۵۔ معاشرتی طبقاتی فرق بچوں کے استحصال کا ایک بڑا سبب ہے۔ نچلے طبقے کے بچے اکثر امیر طبقے کے گھروں میں گھریلو ملازمین کے طور پر کام کرتے ہیں جہاں انہیں کمتر سمجھا جاتا ہے اور ان کے ساتھ سخت رویہ اختیار کیا جاتا ہے۔ یہ سماجی تفریق ان کے بنیادی حقوق کو متاثر کرتی ہے اور انہیں کم عمری میں استحصال کا شکار بنا دیتی ہے۔

۶۔ بعض ثقافتی اور روایتی خیالات بھی بچوں کے استحصال کی وجہ بنتے ہیں۔ بعض جگہوں پر یہ تصور کیا جاتا ہے کہ بچوں کو سختی سے قابو میں رکھنا ضروری ہے یا ان کی مرضی کے بغیر فیصلے کرنا والدین کا حق ہے۔ یہ نظریات بچوں کی ذہنی اور جذباتی آزادی کو محدود کرتے ہیں جس سے ان کی شخصیت پر منفی اثرات مرتب ہوتے ہیں۔

۷۔ بچوں کے ساتھ جنسی زیادتی ایک سنگین مسئلہ ہے مگر معاشرتی دباؤ اور شرمندگی کے خوف سے اس پر کھل کر بات نہیں کی جاتی۔ اس مسئلے پر بات نہ کرنا اور متاثرہ بچوں کو خاموش رہنے پر مجبور کرنا استحصال کرنے والوں کو مزید جری بنا دیتا ہے۔ یہ خاموشی بچوں کے لیے سب سے زیادہ نقصان دہ ہوتی ہے کیونکہ وہ نہ کسی سے مدد مانگ سکتے ہیں اور نہ اپنی تکلیف بیان کر سکتے ہیں۔

۸۔ جدید دور میں انٹرنیٹ اور میڈیا کے غیر مناسب اثرات بچوں کی معصومیت کو متاثر کر رہے ہیں۔ بعض اوقات وہ ایسے مواد کا شکار ہو جاتے ہیں جو ان کے لیے نقصان دہ ہوتا ہے یا سوشل میڈیا کے ذریعے دھوکہ دہی اور استحصال کا نشانہ بنتے ہیں۔ آن لائن استحصال ایک نیا چیلنج ہے جس سے بچانے کے لیے والدین اور اساتذہ کو زیادہ محتاط ہونے کی ضرورت ہے۔ بچوں کے حقوق کے تحفظ کے لیے قوانین تو موجود ہیں لیکن ان پر عمل درآمد نہ ہونے کے باعث استحصال کے واقعات عام ہیں۔ اکثر بچے یا ان کے والدین قانونی پیچیدگیوں، خوف یا بدنامی کے باعث شکایت درج نہیں کرواتے جس کی وجہ سے مجرم بے خوف رہتے ہیں اور بچوں کے خلاف جرائم کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔

یہ تمام عوامل بچوں کے ذہنی اور جسمانی استحصال کی مختلف شکلوں کو واضح کرتے ہیں۔ ان مسائل کو حل کرنے کے لیے ضروری ہے کہ والدین، تعلیمی ادارے، حکومت اور سماج مل کر ایسے اقدامات کریں جو

بچوں کو ایک محفوظ اور خوشحال ماحول فراہم کر سکیں جہاں وہ بغیر کسی خوف کے اپنی زندگی گزار سکیں اور ترقی کر سکیں۔

۲۔ معاصر اُردو افسانے میں بچوں کے ذہنی اور جسمانی استحصال کی صورتیں:

اُردو افسانے میں بچوں کے ذہنی اور جسمانی استحصال کی صورتیں کئی سطح پر واضح کی گئی ہیں۔ یہ صورتحال بچے کی شدید متاثرہ نفسیات کو بھی واضح کرتی ہے۔اس حوالے سے حمزہ حسن شیخ کے کئی افسانے اہمیت کے حامل ہیں۔شعیب خالق کے ہاں ایسے افسانے بنیادی طور پر سماجی صورتحال کے گرد گھومتے ہوتے ہیں۔ ان کو کئی درجات میں بیان کیا جا سکتا ہے۔ شعیب خالق کے ہاں ان موضوعات میں ڈرامائی کیفیت بھی نظر آتی ہے۔ یہ افسانوں کے ساتھ ساتھ ڈرامہ نگار بھی رہے ہیں جس کی وجہ سے افسانوں میں بھی ڈرامائی عناصر واضح طور پر دیکھے جاسکتے ہیں۔

یہ افسانے محض بیانیہ داستانیں نہیں بلکہ ان میں ڈرامے کی فنی خصوصیات بھی نمایاں طور پر موجود ہیں۔ ان کے افسانوں کی ساخت، کرداروں کے مابین مکالمہ اور واقعات کی ترتیب میں ایک خاص ڈرامائی عنصر پایا جاتا ہے جو کہ قاری کو نہ صرف کہانی کے ساتھ جوڑے رکھتا ہے بلکہ اسے ایک تصوراتی منظرنامے میں بھی لے جاتا ہے۔ یہ ڈرامائی اسلوب ان کے افسانوں میں شدت اور تاثر کو بڑھا دیتا ہے اور ان کے کرداروں کے نفسیاتی تجزیے کو مزید گہرائی عطا کرتا ہے۔

شعیب خالق کے افسانوں میں بچوں کی نفسیات کا خاص خیال رکھا گیا ہے، خاص طور پر ان بچوں کی جو کسی نہ کسی طرح ذہنی یا جذباتی صدمے کا شکار ہوتے ہیں۔ ان کے کردار اکثر سماجی ناانصافیوں، والدین کی بے حسی یا جنگ اور تشدد کے سائے میں پلنے والے بچے ہوتے ہیں۔ وہ ان کرداروں کے داخلی کرب کو انتہائی باریک بینی سے بیان کرتے ہیں، جس میں ان کے اندر پنپنے والے خوف، مایوسی اور ناآسودگی کو ایک ڈرامائی پیرائے میں پیش کیا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر ان کے کئی افسانوں میں ایسے بچوں کے کردار سامنے آتے ہیں جو بے بسی اور خوف میں جینے پر مجبور ہیں۔ ان کے والدین کی بے رخی، ان کے معصوم خوابوں کی شکست اور سماجی جبر کے اثرات کو شعیب خالق نے نہایت موثر طریقے سے بیان کیا ہے۔ یہ تمام عناصر ایک ڈرامے کی طرح ترتیب

دیے گئے ہیں جہاں کرداروں کے درمیان خاموشی بھی ایک معنی رکھتی ہے اور ہر چھوٹا واقعہ ایک بڑے المیے کی علامت بن جاتا ہے۔ محمد حنیف لکھتے ہیں:

> "شعیب خالق کے افسانے سماجی حقیقت نگاری کا وہ آئینہ ہیں جس میں معاشرہ اپنی اصل صورت دیکھنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ ان کی تحریریں وہ بے رحم سچائی بیان کرتی ہیں جنھیں لوگ سننا نہیں چاہتے مگر جن سے نظریں چرانا بھی ممکن نہیں۔ ہر کردار، ہر مکالمہ اور ہر منظر سماج کے اندرونی زخموں کو بے نقاب کرتا ہے، جیسے کوئی آئینہ جس میں حقیقت کسی پردے کے بغیر عیاں ہو جاتی ہے"۔(۱۱)

ان کے افسانوں میں ڈرامائی عنصر صرف مکالمے اور واقعات کی ترتیب تک محدود نہیں بلکہ منظر کشی میں بھی اس کا بھرپور اظہار ہوتا ہے۔ وہ ماحول کو اس طرح تخلیق کرتے ہیں کہ وہ محض پس منظر نہیں رہتا بلکہ ایک متحرک قوت کے طور پر کہانی کے بہاؤ میں اپنا کردار ادا کرتا ہے۔ کبھی کوئی خالی سڑک، کبھی بارش میں بھیگی ہوئی کھڑکی یا کسی بچے کے چہرے پر پھیلی خوف کی پرچھائیاں—یہ تمام جزئیات ایک مکمل ڈرامائی کیفیت پیدا کرتی ہیں اور قاری کو افسانے کے جذباتی دھارے میں بہالے جاتی ہیں۔ شعیب خالق کی تحریر میں ڈرامائی عناصر اور بچوں کی متاثرہ نفسیات کا یہ امتزاج انہیں ایک منفرد افسانہ نگار بناتا ہے۔ ان کے افسانے محض بیانیہ کہانیاں نہیں بلکہ نفسیاتی اور جذباتی حقائق کے آئینہ دار ہیں جو نہ صرف قاری کے ذہن پر گہرے نقوش چھوڑتے ہیں بلکہ انہیں زندگی کے ان پہلوؤں پر سوچنے پر مجبور بھی کرتے ہیں جو عموماً نظر انداز ہو جاتے ہیں۔

ان کے افسانوں میں بچوں کے ذہنی استحصال کو نہایت باریک بینی سے پیش کیا گیا ہے۔ وہ اپنی کہانیوں میں معصومیت اور بے بسی کو ایک نفسیاتی گہرائی کے ساتھ بیان کرتی ہیں جس کے ذریعے قاری پر یہ آشکار ہوتا ہے کہ ایک بچے کی دنیا میں ہونے والے جذباتی حادثات کس طرح اس کی پوری شخصیت پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ ان کے افسانے کسی بھیانک حقیقت کو عیاں کرنے کے بجائے اسے دھندلے آئینے میں دکھاتے ہیں، جہاں ظلم، ناانصافی اور استحصال کے عکس نمایاں ہونے کے باوجود انسانیت کی مکمل تصویر کہیں گم ہو جاتی ہے۔ مریم مجید ڈار کے ہاں بچوں کی دنیا، ان کی سوچ، خواب اور خوف ایک نفسیاتی منظرنامے میں تشکیل پاتے ہیں۔ گوپی چند نارنگ لکھتے ہیں:

"کردار محض تخیلاتی پیکر نہیں ہوتے بلکہ وہ سماج کے گہرے نفسیاتی اور تہذیبی دھاروں کا عکس ہوتے ہیں۔ معاشرے کے اس رویے اور مضبوط کردار کی تشکیل میں نہ صرف اس کے ذاتی تجربات بلکہ پورے معاشرتی ماحول کی گونج سنائی دیتی ہے۔ ہر کردار اپنے عہد کے فکری اور جذباتی بحران کا استعارہ بن کر اُبھرتا ہے اور یوں ادب ہمیں اس منظرنامے سے روشناس کراتا ہے جہاں فرد اور سماج کی کشمکش، داخلی تضادات اور اجتماعی شعور کے اتار چڑھاؤ واضح ہو جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ حقیقی ادب میں کردار محض فرد کی نمائندگی نہیں کرتے بلکہ وہ ایک پورے عہد کی علامت بن کر ہمارے سامنے آتے ہیں"۔(۱۲)

ان کے کردار اکثر ایسی صورتِ حال سے گزرتے ہیں جہاں انہیں نظر انداز کیا جاتا ہے، ان کی معصوم خواہشات کا گلا گھونٹا جاتا ہے یا وہ کسی ایسے جذباتی بحران کا شکار ہوتے ہیں جو ان کی داخلی زندگی کو بکھیر دیتا ہے۔ وہ نہ صرف ان معصوم کرداروں کے اندرونی کرب کو نمایاں کرتی ہیں بلکہ اس پورے سماجی ڈھانچے پر بھی تنقید کرتی ہیں جو بچوں کے ذہنی اور جذباتی استحصال کا سبب بنتا ہے۔ ان کے افسانوں میں منظر نگاری بھی گہری نفسیاتی علامتوں سے بھرپور ہوتی ہے۔ ایک ویران گھر، بارش میں اداس کھڑکیاں، خاموش راہداریوں میں دبے پاؤں چلتے بچے—یہ تمام عناصر ان کے افسانوں میں ایک ایسی فضا پیدا کرتے ہیں جہاں قاری خود کو کہانی کے مرکزی کردار کے ساتھ جڑا ہوا محسوس کرتا ہے۔

ان کے افسانوں کی ایک اور نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ وہ جذباتی شدت کو کسی خطیبانہ انداز میں نہیں بلکہ دھیمے، غیر محسوس مگر نہایت مؤثر پیرائے میں بیان کرتی ہیں۔ قاری کو کوئی چیز زبردستی باور کرانے کے بجائے وہ کہانی کے اندر اس کی آنکھیں کھولتی ہیں اور یوں وہ خود ان کرداروں کی تکلیف محسوس کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ مریم مجید ڈار کے افسانے محض داستانیں نہیں بلکہ ہمارے معاشرے کا ایسا آئینہ ہیں جو مکمل طور پر شفاف نہیں بلکہ اس دھند کا شکار ہے جو سماجی ناہمواری، ظلم اور انسانی بے حسی کے نتیجے میں وجود میں آئی ہے۔ ان کے افسانے پڑھنے کے بعد ایک خلش باقی رہتی ہے، ایک ایسی کسک جو انسانی ذہن کو جھنجھوڑتی ہے اور اسے معاشرتی سچائیوں پر غور کرنے پر مجبور کر دیتی ہے۔

مریم مجید ڈار کے افسانوں میں بچوں کے ذہنی استحصال کو نہایت باریک بینی سے پیش کیا گیا ہے۔ وہ اپنی کہانیوں میں معصومیت اور بے بسی کو ایک نفسیاتی گہرائی کے ساتھ بیان کرتی ہیں جس کے ذریعے قاری پر

یہ آشکار ہوتا ہے کہ ایک بچے کی دنیا میں ہونے والے جذباتی حادثات کس طرح اس کی پوری شخصیت پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ ان کے افسانے کسی بھیانک حقیقت کو عیاں کرنے کے بجائے اسے دھندلے آئینے میں دکھاتے ہیں، جہاں ظلم، ناانصافی اور استحصال کے عکس نمایاں ہونے کے باوجود انسانیت کی مکمل تصویر کہیں گم ہو جاتی ہے۔ ایک بچے کی مظلومیت کو نہایت دردناک انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ یہ کہانی ایک ایسے بچے کی ہے جو کسی اور کے گھر میں رہ رہا ہے، جہاں وہ اجنبیت، محرومی اور بے بسی کا شکار ہے۔ اس افسانے میں مریم مجید ڈار نے بچوں کی نفسیاتی پیچیدگیوں کو گہرائی سے بیان کیا ہے، خاص طور پر ایک ایسے معصوم ذہن کی کشمکش جو اپنائیت اور تحفظ کی تلاش میں ہے لیکن اسے مسلسل سرد مہری اور بے حسی کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اس افسانے میں زبان کا استعمال سادہ مگر انتہائی اثر انگیز ہے۔

ان کے اسلوب کی ایک بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ جذباتی شدت کو غیر محسوس انداز میں پیش کرتی ہیں، جہاں قاری خود بخود کہانی کے کرداروں کے ساتھ جُڑ جاتا ہے۔ ان کے جملے طویل نہیں ہوتے لیکن ان میں ایک خاموش چیخ پوشیدہ ہوتی ہے جو قاری کے ذہن پر گہرا اثر چھوڑتی ہے۔ نفسیاتی سطح پر یہ افسانہ ایک بچے کی داخلی دنیا کی نمائندگی کرتا ہے، جو بے حسی اور بیگانگی کے احساسات سے گزرتا ہے۔ وہ محبت اور توجہ کی تلاش میں ہے لیکن ہر جگہ اسے سرد رویّے اور اجنبیت کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ یہ کہانی بچوں کی نفسیاتی ساخت پر ہونے والے اثرات کی ایک پیچیدہ مگر دردناک تصویر پیش کرتی ہے، جہاں ایک معصوم ذہن مسلسل خوف اور غیر یقینی میں مبتلا رہتا ہے۔

> "غصے اور بے بسی نے مجھے سر پٹخنے پر مجبور کر دیا اور میں نے جب آخری بچ جانے والی موم بتی جلائی تو دیکھا کہ گڈو نیم بے ہوشی کے عالم میں بے سدھ پڑا تھا اور دو موٹے موٹے چوہے اس کا بے جان پاؤں کاٹ رہے تھے۔ اس کے بائیں پاؤں پر جگہ جگہ دانتوں کے زخم تھے جن سے خون بہہ رہا تھا اور عین اسی لمحے قاتل چھوٹ گیا۔
>
> میں نے نہایت اطمینان سے ماں کی زنگ آلود قینچی اٹھالی اور اکڑوں گڈو کے سرہانے بیٹھ گیا۔ اس کے منہ سے بہتی رال میں نے اپنی قمیض کے دامن سے پونچھی اور اس کا سر گود میں رکھ لیا۔ ایک ایک کر کے سارے مردے اس کے متعفن وجود سے نکلے اور آس پاس یوں بیٹھ گئے جیسے کوئی بہت مقدس مذہبی رسم ادا کی جانے والی ہو۔

موم بتی کی لرزتی لو میں ان کے سائے دیواروں پر لمبے ہو رہے تھے۔ میں نے گڈو کا ماتھا چوما اور پھر اس کے ہونٹوں پر اپنا ایک ہاتھ جما دیا دوسرے ہاتھ سے زنگ آلود قینچی میں نے اس کے سب سے ڈھیٹ جوڑ، یعنی شہ رگ پر چلا دی۔ ایک حیوانی جھرجھری نے گڈو کے مفلوج حصّے کو بھی تھرا کے رکھ دیا اور خون کی پچکاریاں ٹوٹتے دم کے ردھم کے ساتھ چھوٹتی رہیں۔ جان نکلنے سے ذرا دیر پہلے اس نے آنکھیں میری آنکھوں میں ڈال کر زبان بے زبانی سے "شکریہ بھائی" کہا اور لفافے کی قید سے نجات پا گیا"۔(۱۳)

حمزہ حسن شیخ کے افسانے "آزادی" میں بتایا گیا ہے کہ ہر کوئی اپنے اظہار، اپنی شان و شوکت، خوشحالی اور آزادی کا خواہاں رہتا ہے کہ اسلوب میں آزادی، ایمان سے آزادی، حقوق سے آزادی، انصاف سے آزادی اور انسانیت سے آزادی۔ وہ آزادی کو ان الفاظ میں بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"وہ ایک بار پھر دنیا پر حکومت چاہتے تھے اور کھوئی ہوئی شان و شوکت، پہچان اور عزت واپس حاصل کرنے کا واحد طریقہ صرف آزادی تھا تاکہ وہ کوئی بھی کام اپنی مرضی سے کرنے کے لیے خود مختیار ہوں اور بغیر کسی غلامی کے آزاد حکومت کر سکیں۔ وہ پاگل تھے اپنی شان دشوکت کے لیے۔۔۔۔ اپنی عزت کے لیے۔۔۔۔ اپنی خوشحالی کے لیے۔۔۔ کیونکہ انہوں نے اپنے والدین سے اجداد کی شان و شوکت کے بڑے قصّے سنے تھے اور یہ کہانیاں کئی نسلوں سے ان میں منتقل ہو رہی تھیں"۔(۱۴)

اکثریت یہ جاننے سے قاصر ہوتی ہے کہ آزادی کے صحیح معنی کیا ہیں؟ لیکن پھر بھی وہ اس تحریک کا حصّہ بنتے ہیں اور عوام کا اندھا دھند پیچھا کر رہے ہوتے ہیں کیونکہ ان کے ذہن میں یہ بات بیٹھ چکی تھی کہ آزادی حاصل کرنے کے بعد وہ دنیا کے حقیقی حکمران بن جائیں گے اور ان کی شان و شوکت کے سامنے ساری دنیا جھک جائے گی۔

عابد علی عابد لکھتے ہیں۔

"اسلوب محض الفاظ کے چناؤ یا جملوں کی ساخت کا نام نہیں بلکہ یہ تخلیق کار کی فکری و جذباتی شناخت کا آئینہ ہوتا ہے۔ عابد علی عابد کے نزدیک اسلوب ایک ایسی داخلی کیفیت اور طرزِ اظہار ہے جو کسی بھی ادیب کو دوسروں سے ممتاز کرتا ہے۔ یہ نہ صرف

مصنف کے فکری رجحانات، تہذیبی شعوراور جمالیاتی احساسات کو منعکس کرتا ہے بلکہ
اس کے عہد، معاشرتی تجربات اور نفسیاتی میلانات کو بھی آشکار کرتا ہے۔ یہی اسلوب
ہے جو کسی تخلیق کو وقتی اظہار سے نکال کر دائمی معنویت عطا کرتا ہے"۔(۱۵)

سماجی تناظر میں "پرایاہاتھ" ہمارے معاشرتی رویوں پر ایک گہرا سوالیہ نشان اٹھاتا ہے۔ مریم مجید ڈار نے اس افسانے میں اس رویے کو اُجاگر کیا ہے جس کے تحت بے سہارااور بے آسرا بچوں کو اپنائیت اور محبت سے محروم رکھا جاتا ہے۔ کہانی اس حقیقت کی عکاسی کرتی ہے کہ سماج میں موجود طاقت کے توازن اور درجہ بندی کا براہ راست اثر ان بچوں پر پڑتا ہے جو اپنے حق کے لیے آواز نہیں اٹھاسکتے۔

منظر نگاری کے لحاظ سے جگہوں، رویوں اور جذبات کی ایسی عکاسی کی گئی ہے جو قاری کے ذہن میں ایک مکمل تصویری خاکہ کھینچ دیتی ہے۔ ایک اجنبی گھر کا اداس ماحول، خاموشی، ایک بچے کی سہمتی ہوئی آنکھیں اور اس کے اردگرد موجود بے حس چہرے—یہ تمام جزئیات ایک ایسی فضا پیدا کرتی ہیں جو قاری کو براہ راست کہانی کے درد میں شریک کر دیتی ہیں۔ مریم مجید ڈار کے افسانے محض داستانیں نہیں بلکہ ہمارے معاشرے کا ایسا آئینہ ہیں جو مکمل طور پر شفاف نہیں بلکہ اس دھند کا شکار ہے جو سماجی ناہمواری، ظلم اور انسانی بے حسی کے نتیجے میں وجود میں آئی ہے۔ ان کے افسانے پڑھنے کے بعد ایک خلش باقی رہتی ہے، ایک ایسی کسک جو انسانی ذہن کو جھنجھوڑتی ہے اور اسے معاشرتی سچائیوں پر غور کرنے پر مجبور کر دیتی ہے۔ "پرایاہاتھ" اس کی ایک بہترین مثال ہے جو نہ صرف ایک بچے کی کہانی بیان کرتی ہے بلکہ پورے معاشرتی روّیے کی نقاب کشائی بھی کرتی ہے۔

فرائیڈ کے نظریات انسانی نفسیات کے غیر شعوری محرکات کو سمجھنے میں بنیادی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان کے مطابق، لاشعور انسانی اعمال، خیالات اور احساسات پر گہرا اثر ڈالتا ہے۔ خاص طور پر خواہشات، خوف اور دبے ہوئے جذبات وہ عوامل ہیں جو شخصیت کی تشکیل میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ حمزہ حسن شیخ کے افسانوں میں فرائیڈین نفسیات کے مختلف پہلو نمایاں نظر آتے ہیں، خاص طور پر ان کی کہانی بے نامی میں۔ یہ کہانی شناخت کے بحران، لاشعوری خوفاور وجودی بے معنویت کو مرکز میں رکھتی ہے۔ شیر محمد اختر لکھتے ہیں:

"بچوں کی نفسیات کسی خالی کینوس کی طرح نہیں ہوتی، بلکہ یہ سماج کے دباؤ، رشتوں کی
پیچیدگیوں اور ماحول کی غیر محسوس تربیت سے تشکیل پاتی ہے۔ سیگمنڈ فرائڈ کے

مطابق اگر بچپن میں محبت، اعتماد اور اظہار کی آزادی نہ دی جائے تو بچہ لاشعوری طور پر احساسِ کمتری میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ یہ احساس وقت کے ساتھ اس کی شخصیت میں اس طرح سرایت کر جاتا ہے کہ وہ خود کو ہمیشہ دوسروں سے کمتر، غیر محفوظ اور سماجی دباؤ کا شکار محسوس کرتا ہے اور یوں اس کا باطن ایک ایسی نفسیاتی جنگ کا میدان بن جاتا ہے جس میں وہ خود اپنا حریف ہوتا ہے"۔(۱۶)

افسانے کے کردار ان دیکھے جذباتی بوجھ کے تحت زندگی گزارتے ہیں، جنھیں وہ سمجھنے یا بیان کرنے سے قاصر ہیں۔ فرائیڈین نقطہ نظر سے یہ کردار اپنے لاشعوری اضطراب کی گرفت میں ہیں جو ان کی ذات کو بے نامی کے دائرے میں قید کر دیتا ہے۔ فرائیڈ کے نظریے کے مطابق فرد کا ماضی اور دبے ہوئے تجربات حال میں اس کے رویے پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ بے نامی میں بھی یہی تصور کارفرما نظر آتا ہے جہاں کرداروں کی ذہنی کشمکش دراصل ان کے اندرونی خوف اور دبے ہوئے احساسات کا نتیجہ ہے۔ ان کا اسلوب قاری کو نفسیاتی الجھنوں کے اس دائرے میں لے جاتا ہے جہاں حقیقت اور لاشعور کے درمیان کی لکیر دھندلا جاتی ہے۔

حمزہ حسن شیخ کے افسانوں میں اسلوب کی ایک خاص نفسیاتی اور فلسفیانہ گہرائی پائی جاتی ہے جو قاری کو ایک منفرد ذہنی اور جذباتی تجربے سے گزارتا ہے۔ ان کی تحریریں سطحی بیانیے سے گریز کرتے ہوئے انسانی نفسیات، شناخت کے بحران اور وجودی مسائل پر روشنی ڈالتی ہیں۔ وہ زبان کے انتخاب میں نہایت محتاط رہتے ہیں اور ان کا طرزِ تحریر علامتی اور استعاراتی ہوتا ہے جس میں سادگی کے ساتھ ایک غیر محسوس پیچیدگی شامل ہوتی ہے۔

ان کے جملے اکثر مختصر اور بامعنی ہوتے ہیں جو کہانی کی فضا کو گہرا اور پراسرار بنا دیتے ہیں۔ وہ قاری کو کہانی میں براہ راست مداخلت کی اجازت نہیں دیتے بلکہ ایک ایسا اسلوب اپناتے ہیں جہاں کہانی کے مفاہیم آہستہ آہستہ کھلتے ہیں۔ ان کی زبان میں شاعرانہ آہنگ بھی شامل ہوتا ہے جو ان کے بیانیے کو ایک داخلی موسیقیت عطا کرتا ہے۔ ان کی تحریریں ایک مخصوص فکری کثافت رکھتی ہیں، جہاں ہر جملہ ایک نئی جہت کو دریافت کرنے کا موقع فراہم کرتا ہے۔

افسانے کی تشکیل کے دوران وہ کسی ایک مخصوص واقعے پر زور دینے کے بجائے کرداروں کی داخلی دنیا اور لاشعوری کیفیات کو نمایاں کرتے ہیں۔ کہانی میں واقعاتی تسلسل کے بجائے ایک ایسی ساخت تشکیل دی جاتی ہے جہاں قاری کو خود کہانی کے مفاہیم اخذ کرنے پڑتے ہیں۔ ان کے کردار اکثر کسی اندرونی کشمکش یا نفسیاتی الجھن کا شکار ہوتے ہیں اور کہانی کا بیانیہ ان کے ذہنی اضطراب کو اس انداز میں اُجاگر کرتا ہے کہ قاری خود کو ان کی کیفیت کا حصّہ محسوس کرتا ہے۔

افسانہ "بے ناگی" اس تخلیقی انداز کی ایک بہترین مثال ہے جہاں شناخت کا بحران، داخلی بے چینی اور وجودی تنہائی کی گونج محسوس کی جاسکتی ہے۔ کہانی کا مرکزی کردار کسی واضح شناخت سے محروم ہے اور وہ اپنے احساسات، خوف اور یادوں کے دھندلے دھاگوں میں الجھا رہتا ہے۔ یہ کہانی ایک نفسیاتی کینوس پر بنتی ہے جہاں حقیقت اور لاشعور کی سرحدیں مدھم ہو جاتی ہیں۔ حمزہ حسن شیخ کا افسانوی بیانیہ جدید اُردو ادب میں ایک منفرد حیثیت رکھتا ہے۔ ان کے افسانے محض کہانیاں نہیں بلکہ ایک ذہنی و جذباتی تجربہ ہیں جو قاری کو سوچنے اور محسوس کرنے پر مجبور کر دیتے ہیں۔ ان کی تحریر میں نفسیاتی گہرائی، فکری معنویت اور تخلیقی تازگی کا امتزاج انہیں اُردو افسانے کے ایک ممتاز فنکار کے طور پر نمایاں کرتا ہے۔ جدید ادب نے نفسیات، فلسفہ اور علم البشریات کے اثرات کو نہ صرف جذب کیا ہے بلکہ ان علوم کی روشنی میں اپنے بیانیے کو وسعت بھی دی ہے۔ جب فرائیڈ، یونگ، سارتر اور فوکو جیسے مفکرین نے انسانی شعور، لاشعور، وجودیت اور طاقت کے ڈھانچوں پر نظریات پیش کیے تو یہ خیالات ادب کی دنیا میں بھی سرایت کر گئے۔ عالمی ادب کے ساتھ ساتھ اُردو ادب نے بھی ان فکری رجحانات کو اپنے بیانیے میں جگہ دی اور جدید اُردو افسانہ نگاروں نے انہی مباحث کو اپنے منفرد انداز میں برتا۔

اُردو افسانہ نگاری کی روایت ہمیشہ ہی فکری ارتقا کے عمل سے گزرتی رہی ہے۔ ابتدا میں حقیقت نگاری اور سماجی مسائل اُردو افسانے کا بنیادی محور رہے مگر جیسے جیسے عالمی فکری تحریکوں کا اثر بڑھا، اُردو افسانے میں بھی نفسیاتی، فلسفیانہ اور بشریاتی عناصر نمایاں ہونے لگے۔ جدید اُردو افسانہ نگاروں نے کرداروں کی نفسیاتی پیچیدگیوں کو ایک نئے انداز میں اُجاگر کیا اور کہانی کی بنت میں شعور کی رو، تحت الشعور اور مابعد الطبیعیاتی تصورات کو شامل کیا۔ یہ انداز محض بیانیے تک محدود نہیں رہا بلکہ افسانوں کی فکری جہت کو بھی تبدیل کر دیا۔

نفسیات کی تاثیر اُردو افسانے میں گہرائی سے محسوس کی جا سکتی ہے۔ فرائیڈ کے نظریہ لاشعور نے کرداروں کے داخلی تضادات اور دبے ہوئے جذبات کو کہانیوں میں ایک نئی جہت دی۔ کئی افسانہ نگاروں نے فرد کی داخلی کشمکش، خوابوں کی تعبیر اور ماضی کے صدمات کو کہانی کے بنیادی عناصر کے طور پر استعمال کیا۔ اسی طرح یونگ کے اجتماعی لاشعور اور ارکی ٹائپس (archetypes) کے تصورات نے اُردو افسانہ میں علامتی اور استعاراتی پہلوؤں کو مزید وسعت دی۔ اس کے نتیجے میں جدید اُردو افسانہ محض واقعاتی کہانی سے نکل کر ایک فکری تجربہ بن گیا۔

شعیب خالق کا بیانیہ بچوں کے ذہنی اور جذباتی استحصال کو ایک گہرے وجودی بحران کے طور پر پیش کرتا ہے۔ ان کے افسانوں میں بچے اپنی شناخت کی تلاش میں ہیں مگر انہیں ایسا ماحول میسر نہیں جہاں وہ خود کو مکمل محسوس کر سکیں۔ وہ عدمِ تحفظ، نارسائی اور بے معنی جبر کے احساس میں پلتے ہیں جہاں ان کے خواب ادھورے رہ جاتے ہیں، سوال بے جواب رہتے ہیں اور ان کی زندگی خود ان کے لیے ایک غیر واضح پہیلی بن جاتی ہے۔

یہی وہ کیفیت ہے جو انہیں وجودیت کے گہرے خلا میں دھکیل دیتی ہے۔ وہ اپنی ذات کی کھوج میں نکلتے ہیں مگر انہیں ہر سمت ایک سرد دیوار کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ ان کے معصوم ذہنوں پر بوجھل سوالات سائے کی طرح منڈلاتے ہیں—یہ دنیا کیا ہے؟ ہم یہاں کیوں ہیں؟ اگر ہمارے جذبات، خواب اور تکالیف کی کوئی وقعت نہیں تو پھر ہم وجود رکھتے بھی ہیں یا نہیں؟ شعیب خالق کے افسانوں میں یہ سوال محض پس منظر میں نہیں رہتا بلکہ کرداروں کی نفسیاتی تشکیل میں مرکزی حیثیت رکھتا ہے۔ یوں ان کے افسانے بچوں کے داخلی بحران کو محض جذباتی رنگ میں نہیں دیکھتے بلکہ اسے ایک فکری، فلسفیانہ اور وجودی کشمکش کے تناظر میں پیش کرتے ہیں جہاں معصومیت اور کرب ایک ساتھ پروان چڑھتے ہیں۔ نیئر عباس لکھتے ہیں:

> "جب بچپن میں جسمانی استحصال سہنا پڑے تو یہ صرف جسم پر نہیں بلکہ روح پر بھی گہرا زخم چھوڑ دیتا ہے۔ ایسا بچہ بڑا ہو کر نہ صرف دنیا سے بیگانہ محسوس کرتا ہے بلکہ اپنے ہی وجود پر سوال اٹھانے لگتا ہے۔ وہ زندگی کے معنی تلاش کرتا ہے مگر ماضی کی اذیتیں ہر جواب کو بے معنی بنا دیتی ہیں۔ یہی کرب اسے وجودیت کے اس موڑ پر لے آتا ہے

جہاں وہ یا تو اپنی شناخت کی تشکیل میں سر گرداں رہتا ہے یا پھر زندگی کو ایک بے مقصد خلا سمجھ کر اس سے لاتعلق ہو جاتا ہے"۔(۱۷)

فلسفہ بھی جدید اُردو افسانے پر گہرے اثرات مرتب کرتا ہے۔ وجودیت (Existentialism) کا رجحان جو عالمی ادب میں کیرکیگارڈ، ہائیڈیگر اور سارتر جیسے فلسفیوں کے ذریعے ابھرا۔ اُردو افسانے میں بھی نمایاں نظر آتا ہے۔ وجودی بحران، بے معنویت اور انسانی اختیار کے مسائل کئی جدید افسانہ نگاروں کے بیانیے میں اہم مقام رکھتے ہیں۔ وہ کردار جو اپنی زندگی کی معنویت تلاش کرتے ہیں یا کسی ایسے خلا میں گرفتار نظر آتے ہیں جہاں تمام روایتی سچائیاں بے معنی ہو جاتی ہیں۔ یہ سب وجودیت کے اثرات کی نشانیاں ہیں۔ علم البشریات (Anthropology) کا اثر بھی اُردو افسانہ میں نمایاں ہے۔ خاص طور پر، ثقافتی شناخت، معاشرتی ڈھانچوں اور روایات کے ٹکراؤ کو کہانیوں میں ایک نئے زاویے سے پیش کیا جانے لگا ہے۔ جدید افسانہ نگاروں نے فرد اور معاشرے کے تعلق کو بشریاتی نقطہ نظر سے دیکھنا شروع کیا اور کرداروں کی نفسیاتی و سماجی تشکیل کو ایک وسیع تر ثقافتی تناظر میں سمجھنے کی کوشش کی۔

یہ تمام رجحانات عالمی ادب کے ساتھ ساتھ اُردو افسانے میں بھی ایک فکری اور تخلیقی تحریک کا باعث بنے۔ اُردو افسانہ نگاروں نے نہ صرف عالمی فکری مباحث سے خود کو ہم آہنگ کیا بلکہ انہیں اپنی تہذیبی اور ادبی روایت میں جذب کر کے ایک ایسا اسلوب تخلیق کیا جو جدید اور مقامی دونوں سطحوں پر اثر رکھتا ہے۔ یوں جدید اُردو افسانہ محض کہانی کہنے کا فن نہیں رہا بلکہ یہ نفسیات، فلسفہ اور بشریات کے باہم امتزاج سے ایک ایسی فکری تجربہ گاہ بن گیا ہے جہاں زندگی کے پیچیدہ ترین سوالات کو نئے اور منفرد پیرایے میں بیان کیا جاتا ہے۔

اُردو افسانہ جدید دور میں انسانی مسائل کے نہایت پیچیدہ پہلوؤں کو اُجاگر کرنے کا ذریعہ بنا ہے۔ خاص طور پر بچوں کے ذہنی اور جسمانی استحصال کو ایک اہم موضوع کے طور پر دیکھا جا سکتا ہے۔ بچوں کے خلاف ہونے والے اس استحصال کے کئی سماجی، نفسیاتی اور ثقافتی محرکات ہیں جو افسانے میں حقیقت کے گہرے ادراک کے ساتھ پیش کیے جاتے ہیں۔ معاشرتی ناہمواری اور طبقاتی تقسیم ایسے عوامل میں شامل ہیں جو بچوں کے استحصال کا بنیادی سبب بنتے ہیں۔ کمزور معاشی حالات میں گھرے خاندان اپنے بچوں کو مزدوری پر مجبور کر دیتے ہیں جہاں ان کا نہ صرف جسمانی استحصال ہوتا ہے بلکہ ذہنی نشوونما بھی متاثر ہوتی ہے۔ جدید اُردو افسانہ

ان بچوں کی کہانیوں کو بیان کرتا ہے جو معصوم عمریں گلیوں، کارخانوں اور فیکٹریوں میں گزارنے پر مجبور ہوتے ہیں جہاں ان کے بنیادی حقوق کی پامالی معمول بن جاتی ہے۔

بچوں کے ذہنی استحصال کے پیچھے نفسیاتی عوامل بھی کارفرما ہوتے ہیں۔ بعض اوقات والدین یا سرپرست اپنی ناکام خواہشات کو بچوں پر مسلط کر دیتے ہیں، انہیں غیر ضروری دباؤ میں رکھتے ہیں اور ان کی شخصیت کو اپنی مرضی کے سانچے میں ڈھالنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اُردو افسانے میں کئی کردار ایسے ملتے ہیں جو بچپن میں سختی، لاپرواہی، یا عدم توجہی کا شکار ہو کر زندگی میں شدید نفسیاتی الجھنوں میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ یہ استحصال بعض اوقات جذباتی بلیک میلنگ کی شکل میں بھی سامنے آتا ہے، جہاں بچوں کو خوف، جرم یا خود اعتمادی کی کمی جیسے مسائل میں دھکیل دیا جاتا ہے۔ فردوس مرزا لکھتے ہیں:

> "جسمانی استحصال محض ایک ظلم نہیں بلکہ انسانیت کے چہرے پر وہ بدنما داغ ہے جو نہ وقت کے ساتھ مٹتا ہے اور نہ الفاظ کے ساتھ دھلتا ہے۔ یہ جبر صرف جسم پر نہیں بلکہ روح کی گہرائیوں میں اتر کر خوابوں کو مسخ کر دیتا ہے، معصومیت کو زخمی کر دیتا ہے اور وجود کو بے مقصد خلا میں دھکیل دیتا ہے۔ یہ نہ صرف طاقت کے وحشیانہ اظہار کی علامت ہے بلکہ ایک ایسے معاشرے کی نشانی بھی ہے جو ظلم کو برداشت کرنے کا عادی ہو چکا ہے۔ جب کوئی ہاتھ معصوم جسم پر اٹھتا ہے تو درحقیقت وہ تہذیب کے ماتھے پر لگنے والا وہ زخم ہوتا ہے جو صدیوں تک ناسور بنا رہتا ہے"۔(۱۸)

اُردو ادب میں بچوں کے ذہنی استحصال کی کئی ممکنہ صورتیں نمایاں کی گئی ہیں لیکن بعض صورتیں ایسی بھی ہیں جو عدم میں رہ کر یعنی نادیدہ یا غیر محسوس انداز میں ان کی نفسیات پر اثر انداز ہوتی ہیں۔ یہ وہ پہلو ہیں جو بظاہر عام زندگی میں نظر نہیں آتے مگر گہرے ادبی مطالعے میں ان کی جھلک واضح ہو جاتی ہے۔

پہلی ممکنہ صورت وہ نظر انداز کیے جانے کا احساس ہے جو بچوں میں عدم موجودگی کے طور پر موجود رہتا ہے۔ اُردو افسانوں میں کئی ایسے کردار نظر آتے ہیں جو والدین یا سرپرستوں کی عدم توجہی اور جذباتی سرد مہری کا شکار ہوتے ہیں۔ وہ اپنے جذبات کا اظہار کرنا چاہتے ہیں مگر انہیں ایسا ماحول نہیں ملتا جہاں وہ کھل کر بات کر سکیں۔ اس طرح ان کے اندر ایک خاموش بغاوت اور نفسیاتی الجھن پیدا ہو جاتی ہے جو بڑے ہو کر ان کی شخصیت پر گہرے اثرات مرتب کرتی ہے۔

دوسری صورت خوف اور غیر یقینی کی کیفیت ہے جو اکثر گھریلو تنازعات، والدین کے جھگڑوں یا مسلسل بدلتے ہوئے روّیوں کے باعث بچوں کے ذہن میں سرایت کر جاتی ہے۔ اُردو ادب میں کئی کردار ایسے ملتے ہیں جو گھریلو ماحول میں مستقل کشیدگی کا شکار رہتے ہیں۔ یہ کیفیت عدم میں رہتے ہوئے ان کے رویے، اعتماد اور جذباتی توازن پر اثر انداز ہوتی ہے۔ وہ شعوری طور پر اس جبر کو محسوس نہیں کر پاتے لیکن ان کے لاشعور میں یہ خوف سرایت کر جاتا ہے جو ان کے بڑھے ہو کر کیے گئے فیصلوں پر اثر انداز ہوتا ہے۔

وہ نامکمل خواب ہیں جو بچوں کو دکھائے تو جاتے ہیں مگر ان کی تکمیل کے لیے انہیں مناسب وسائل اور مواقع فراہم نہیں کیے جاتے۔ اُردو افسانے میں ایسے کردار بارہا نظر آتے ہیں جو بلند توقعات کا شکار ہوتے ہیں مگر ان کی حقیقت کچھ اور نکلتی ہے۔ سماج اور خاندان ان سے کچھ بننے کی اُمید رکھتا ہے لیکن جب یہ اُمیدیں پوری نہیں ہو پاتیں تو بچے ایک مستقل احساسِ ناکامی میں مبتلا ہو جاتے ہیں جو ان کی ذہنی صحت پر عدم موجودگی کے باوجود گہرے اثرات چھوڑتا ہے۔ طبقاتی تقسیم سے پیدا ہونے والا احساسِ کمتری ہے۔ کئی اُردو کہانیوں میں یہ پہلو اس طرح اُبھرتا ہے کہ بچے براہِ راست کسی استحصال کا شکار نہیں ہوتے مگر اپنے اردگرد کے ماحول میں خود کو کمتر محسوس کرنے لگتے ہیں۔ غربت اور امارت کے درمیان واضح فرق، تعلیمی اداروں میں مختلف طبقوں کے بچوں کے درمیان موجود فاصلہ اور سماجی حیثیت کا اثر ایک نفسیاتی استحصال کی شکل اختیار کر لیتا ہے جو عدم میں رہ کر بچوں کی شخصیت کو آہستہ آہستہ مسخ کر دیتا ہے۔

وہ نامعلوم دباؤ ہے جو بچوں پر اس وقت آتا ہے جب ان سے ان کی عمر سے زیادہ کی توقعات رکھی جاتی ہیں۔ اُردو ادب میں ایسے کردار بھی ملتے ہیں جنھیں شعوری طور پر کسی مشقت میں نہیں جھونکا جاتا لیکن ان سے ایسا طرزِ عمل اختیار کرنے کی امید کی جاتی ہے جو ان کی فطرت کے برعکس ہوتا ہے۔ مثلاً بعض افسانوی کرداروں میں بچے اپنے والدین کے غم، غربت یا ناکامیوں کا بوجھ اپنے کندھوں پر محسوس کرتے ہیں، چاہے ان سے براہِ راست ایسا کچھ کہا نہ جائے۔ یہ نفسیاتی بوجھ انہیں اندر ہی اندر گھٹن کا شکار کر دیتا ہے۔

یہ تمام صورتیں براہِ راست جبر اور ظلم کی شکل میں ظاہر نہیں ہوتیں بلکہ بچوں کے لاشعور میں غیر محسوس انداز میں سرایت کرتی ہیں۔ اُردو ادب میں ایسے کرداروں کو تخلیق کر کے دراصل یہ دکھانے کی کوشش کی گئی ہے کہ بچوں کا استحصال صرف واضح جسمانی یا ذہنی تشدد تک محدود نہیں بلکہ بعض اوقات وہ دکھ اور جبر بھی ان کے ساتھ رہتا ہے جو کبھی زبان پر نہیں آتا مگر زندگی بھر ان کے وجود کا حصّہ بنا رہتا ہے۔

سماجی اور ثقافتی رویے بھی بچوں کے استحصال کو ہوا دیتے ہیں۔ قدامت پسند معاشروں میں بچوں کی رائے کو اہمیت نہیں دی جاتی، ان کے احساسات کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے اور انہیں محض بڑوں کی فرماں برداری سکھائی جاتی ہے۔ اس رویے کے باعث بچے اپنی اندرونی کشمکش کو سمجھنے اور اس کا اظہار کرنے میں ناکام رہتے ہیں جو ان کے ذہنی ارتقاء میں رکاوٹ بنتا ہے۔ اُردو افسانہ ان کہانیوں کو بیان کرتا ہے جہاں بچے اپنے ہی گھروں میں غیر محسوس طریقے سے جذباتی اور نفسیاتی جبر کا سامنا کرتے ہیں۔

جدید اُردو افسانہ ان تمام مسائل کو بڑی باریکی سے پیش کرتا ہے جہاں بچے مختلف نوعیت کے استحصال کا شکار ہوتے ہیں۔ ان افسانوں میں بعض اوقات یہ بھی دکھایا جاتا ہے کہ ایک استحصالی نظام کیسے نسلاً بعد نسلٍ خود کو دہراتا ہے اور کس طرح ایک استحصال زدہ بچہ بڑا ہو کر دوسروں کے ساتھ وہی سلوک دہراتا ہے جو اس کے ساتھ کیا گیا تھا۔ ان کہانیوں میں درد، المیہ اور سچائی کی وہ گونج موجود ہوتی ہے جو قاری کو سماجی شعور کی نئی جہتوں سے روشناس کراتی ہے۔

صورتیں:

اُردو افسانے میں بچوں کے ذہنی و جسمانی استحصال کی صورتیں درج ذیل ہیں:

۱۔ جدید اُردو افسانے میں بچوں کے ذہنی استحصال کے مختلف پہلو اجاگر کیے گئے ہیں جن میں خاص طور پر وہ بچے شامل ہیں جو یتیم ہو جاتے ہیں اور دوسروں کے رحم و کرم پر زندگی گزارتے ہیں۔ ان بچوں کو اکثر نہ صرف گھر کے افراد کی بے حسی کا سامنا کرنا پڑتا ہے بلکہ انھیں مستقل طور پر احساس دلایا جاتا ہے کہ وہ کسی پر بوجھ ہیں۔ اس طرح کا رویہ ان کی خود اعتمادی کو متاثر کرتا ہے اور وہ اپنی شخصیت کو کمتر سمجھنے لگتے ہیں۔

۲۔ ایسے بچے جو اپنے والدین کی وفات کے بعد قریبی رشتہ داروں یا کسی اور کے گھر میں پرورش پاتے ہیں، انھیں جذباتی لاپروائی اور نفسیاتی دباؤ کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ ان کے ساتھ ایک دوسرے درجے کے فرد جیسا سلوک کیا جاتا ہے، ان کی ضروریات اور خواہشات کو نظر انداز کیا جاتا ہے اور بعض اوقات انہیں گھریلو کاموں میں اس طرح مصروف کر دیا جاتا ہے کہ ان کی تعلیمی ترقی ممکن نہیں رہتی۔ اس سلوک سے وہ خود کو غیر اہم محسوس کرنے لگتے ہیں اور ان کی شخصیت پر عدم تحفظ کا احساس غالب آجاتا ہے۔

۳۔ کئی اُردو افسانوں میں ایسے بچوں کی نفسیاتی کیفیت کو بیان کیا گیا ہے جو کسی اور کے گھر میں رہتے ہوئے اپنا کوئی حق نہیں جتا سکتے۔ وہ اپنی رائے دینے سے کتراتے ہیں، خاموشی کو اپنا محافظ بنا لیتے ہیں اور ان کے جذبات کو کوئی اہمیت نہیں دی جاتی۔ نتیجتاً ان کی شخصیت میں شدید احساسِ محرومی جنم لیتا ہے جو ان کے رویے اور طرزِ زندگی پر گہرے اثرات مرتب کرتا ہے۔

۴۔ بچوں سے مزدوری کروانا صرف جسمانی استحصال تک محدود نہیں بلکہ ان کے ذہنی اور جذباتی وجود پر بھی گہرے اثرات چھوڑتا ہے۔ جو بچے کم عمری میں ہی مزدوری کے میدان میں اتار دیے جاتے ہیں، ان کی سوچ اور زندگی کے بارے میں تصور عام بچوں سے مختلف ہو جاتا ہے۔ انہیں کھیل کود، تعلیم اور دیگر عام سرگرمیوں سے محروم کر دیا جاتا ہے جس کے نتیجے میں وہ وقت سے پہلے ذمہ داریوں کے بوجھ تلے دب جاتے ہیں اور ان کے اندر زندگی کے بارے میں منفی خیالات جنم لینے لگتے ہیں۔

۵۔ جبری مشقت کرنے والے بچے مستقل دباؤ کا شکار ہوتے ہیں۔ مالکان اور نگرانوں کی سختیاں، گالی گلوچ اور کام میں معمولی غلطیوں پر ملنے والی سزائیں ان کے ذہنی سکون کو تباہ کر دیتی ہیں۔ وہ ہمیشہ خوف میں مبتلا رہتے ہیں اور ان کے اندر خود اعتمادی کم ہوتی چلی جاتی ہے۔ ایسے بچے اکثر بولنے اور اپنی رائے کا اظہار کرنے سے گھبراتے ہیں کیونکہ ان کے ساتھ ایسا سلوک کیا جاتا ہے جیسے ان کی کوئی رائے یا اہمیت نہ ہو۔

۶۔ محنت کش بچوں کو تعلیم کے مواقع نہیں ملتے، جس کی وجہ سے وہ ایک محدود زندگی گزارنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ انہیں روزانہ کام پر جانے اور اپنی ضروریات پوری کرنے کی فکر لاحق ہوتی ہے جس کی وجہ سے ان کا ذہنی دباؤ بڑھ جاتا ہے۔ وہ مسلسل جسمانی مشقت اور ذہنی دباؤ کے باعث وقت سے پہلے بالغ ہو جاتے ہیں اور ان کی زندگی کے معصوم رنگ ختم ہو جاتے ہیں۔ کم اُجرت اور سخت محنت بچوں کے ذہنی استحصال میں اضافے کا باعث بنتی ہے۔ ایسے بچے جو کارخانوں، ہوٹلوں، ورکشاپوں یا گھریلو کاموں میں مصروف رہتے ہیں، ان کے ساتھ نہ صرف بدسلوکی کی جاتی ہے بلکہ ان پر مسلسل کام کا دباؤ ڈال کر انھیں ہر وقت ذہنی دباؤ میں رکھا جاتا ہے۔ وہ اپنی عمر کے مطابق ترقی نہیں کر پاتے اور ان کے اندر احساسِ کمتری پیدا ہو جاتا ہے۔

۷۔ اُردو افسانے میں کام کرنے والے بچوں کی زندگیوں کو اس نظر سے بھی دیکھا گیا ہے کہ وہ ایک مستقل خوف اور غیر یقینی کی حالت میں زندگی گزارتے ہیں۔ انھیں ہر لمحہ اس بات کا ڈر رہتا ہے کہ اگر انھوں نے کام میں کوئی کوتاہی کی تو انہیں بے دخل کر دیا جائے گا یا سخت سزا دی جائے گی۔ یہ خوف ان کے ذہنی نشوونما کو متاثر کرتا ہے اور ان کے اندر ایک مستقل بے چینی پیدا کر دیتا ہے۔

۸۔ ایسے بچے جو مزدوری کرتے ہیں یا دوسروں کے گھروں میں رہنے پر مجبور ہیں، اکثر سماجی رویوں کا بھی شکار ہوتے ہیں۔ انھیں عام بچوں کی طرح محبت اور توجہ نہیں ملتی بلکہ ان کے ساتھ تحقیر آمیز رویہ رکھا جاتا ہے۔ اس سے ان کی شخصیت پر گہرے منفی اثرات مرتب ہوتے ہیں اور وہ اپنے مستقبل کے حوالے سے مایوسی کا شکار ہو جاتے ہیں۔

جدید اُردو افسانے میں ان بچوں کی زندگی کے تضادات کو اُجاگر کیا گیا ہے جو ایک طرف کم عمری میں سخت حالات کا سامنا کر رہے ہوتے ہیں۔ یہ ذہنی کشمکش انہیں اندر سے توڑ دیتی ہے اور ان کے اندر زندگی کے بارے میں ایک مختلف، تلخ اور سرد رویہ پیدا کر دیتی ہے۔

حوالہ جات

۱۔ ڈاکٹر سلیم آغا قزلباش، اُردو افسانے کے رجحانات، انجمن ترقی ادب لاہور، ۲۰۰۲ء، ص ۳۲۱

۲۔ علی محمد صدیقی، ترقی پسند ادب، بک پوائنٹ کراچی، ۱۹۹۷ء، ص ۱۲۹

۳۔ شہزاد احمد، دوسرا رخ، بک کارنر کراچی، ۱۹۹۹ء، ص ۱۶۷

۴۔ کارل ینگ، شخصیت اور نظریات، مشمولہ، ادب رنگ، نذیر اقبال، فردوس پرنٹنگ پریس لاہور، ۲۰۰۹ء، ص ۲۴۳

۵۔ مریم مجید ڈار، پینٹ مشمولہ سوچ زار، فکشن ہاؤس کراچی، ۲۰۱۹ء، ص ۱۸۱

۶۔ حمزہ حسن شیخ، قیدی، نیشنل بُک فاؤنڈیشن، اسلام آباد، ۲۰۲۵ء، ص ۱۳-۱۴

۷۔ نیلم احمد بشیر، عہد حاضر کا افسانہ، مشمولہ، صبح بہاراں، بھیرہ پبلکیشن، ۲۰۱۷ء، ص ۵۶

۸۔ مریم مجید ڈار، پینٹ، ص ۴۴

۹۔ حمزہ حسن شیخ، قیدی، ص ۳۳

۱۰۔ جمیل احمد عدیل، اُردو افسانہ نقش، نگارشات پبلکیشن، لاہور، ۲۰۰۰ء، ص ۲۶۵

۱۱۔ محمد حنیف، شعیب خالق کے افسانے، مشمولہ، کولاج، نظر اقبال، کولاج، پبلیکیشنز، لاہور، ۲۰۰۹ء، ص ۳۶

۱۲۔ گوپی چند نارنگ، بیسویں صدی کا ادب، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۲ء، ص ۳۷۹

۱۳۔ مریم مجید ڈار، لفافے کی موت، ص ۲۱۵

۱۴۔ حمزہ حسن شیخ، قیدی، ص ۵۴

۱۵۔ عابد علی عابد، اسلوب، نگارشات پبلکیشن، لاہور، ۱۹۹۷ء، ص ۲۴۸

۱۶۔ شیر محمد اختر، سیگمنٹ فرائیڈ ایک مطالعہ، مشمولہ، نظریات، شمارہ نمبر ۲۱، مہارن پبلیکیشن، لاہور، ۲۰۰۷ء، ص ۲۱

۱۷۔ نئیر عباس، وجودیت: شناخت کا بحران، القرا پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۱ء، ص ۲۷۶

۱۸۔ فردوس مرزا، سماجیاتی مطالعے، مشولہ، فنون، شمارہ ۳۷، کاروان پبلی کیشن، لاہور، ۲۰۰۷ء، ص ۳۷

باب سوم:

معاصر اُردو افسانے میں بچوں کی تعلیمی اور معاشی استحصال: چائلڈ لیبر کی پیشکش

معاصر اُردو افسانہ بچوں کے تعلیمی اور معاشی استحصال کو ایک گہرے سماجی اور فلسفیانہ پس منظر میں پیش کرتا ہے۔ اکیسویں صدی میں، جہاں تیز رفتار ترقی، معاشی عدم مساوات اور طبقاتی کشمکش مزید پیچیدہ ہو چکی ہے۔ جدید افسانہ نگاروں نے چائلڈ لیبر اور تعلیمی استحصال کے موضوعات کو نئے انداز میں پیش کیا ہے۔ ترقی پسند تحریک کے زیرِ اثر، اُردو افسانہ ابتدا ہی سے محنت کش طبقے کے مسائل، استحصال اور سماجی ناانصافی کو اُجاگر کرتا رہا ہے اور بچوں کے ساتھ ہونے والے ظلم و ستم پر بھی قلم اٹھایا گیا ہے۔

ترقی پسند تحریک کے افسانہ نگاروں نے چائلڈ لیبر کو سرمایہ دارانہ نظام کی ایک بھیانک حقیقت کے طور پر بیان کیا ہے۔ ان افسانوں میں معاشی بدحالی، جاگیر داری کے استبداد اور سرمایہ دارانہ استحصال کو موضوع بنایا گیا، جہاں مزدوروں کے بچے بھی استحصالی چکی میں پس رہے تھے۔ سعادت حسن منٹو، کرشن چندر اور احمد ندیم قاسمی جیسے افسانہ نگاروں نے ایسے کردار تخلیق کیے جو کم عمری میں فیکٹریوں، ورکشاپوں اور کھیتوں میں مزدوری کرتے نظر آتے ہیں اور ان کے تعلیمی خواب چکنا چور ہو جاتے ہیں۔ یہ کہانیاں سرمایہ داری کے بطن میں چھپے اس تلخ سچ کو بے نقاب کرتی ہیں کہ طبقاتی تقسیم کی وجہ سے غریبوں کے بچے کم اُجرت پر محنت کرنے پر مجبور ہوتے ہیں جبکہ امیر طبقے کے بچے اعلیٰ تعلیم اور آرام دہ زندگی سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔

اکیسویں صدی میں جدید افسانہ نگاروں نے چائلڈ لیبر کو ایک نئے تناظر میں دیکھا ہے۔ اب محض استحصالی سرمایہ دار ہی کہانیوں کا مرکزی مسئلہ نہیں بلکہ وہ پیچیدہ سماجی، معاشی اور سیاسی عوامل بھی زیرِ بحث آتے ہیں جو بچوں کو تعلیم سے محروم کر کے مزدوری پر مجبور کرتے ہیں۔ گلوبلائزیشن کے اثرات، نیو لبرل اکنامی اور سوشل میڈیا کے عہد میں چائلڈ لیبر صرف ایک روایتی فیکٹری یا کھیت کا مسئلہ نہیں رہا بلکہ یہ جدید ٹیکنالوجی، ڈیجیٹل مزدوری اور کم اجرت پر گھریلو صنعتوں میں کام کرنے تک پھیل گیا ہے۔

کارل مارکس کا نظریہ چائلڈ لیبر کی بحث میں مرکزی مقام رکھتا ہے۔ مارکس نے سرمایہ دارانہ نظام کو تنقید کا نشانہ بناتے ہوئے یہ واضح کیا کہ کس طرح سرمایہ دارانہ معیشت میں محنت کش طبقہ استحصال کا شکار ہوتا ہے۔ اس کے مطابق سرمایہ دار طبقہ کم اجرت پر مزدوروں کا استحصال کرتا ہے اور اس میں بچوں کی محنت کا استحصال بھی شامل ہے کیونکہ وہ سب سے سستا مزدور ہوتے ہیں۔ مارکس نے یہ بھی نشاندہی کی کہ سرمایہ داری صرف بالغ مزدوروں کو نہیں بلکہ بچوں کو بھی ایک پیداواری قوت کے طور پر دیکھتی ہے جس کا مقصد زیادہ سے زیادہ منافع کمانا ہوتا ہے۔ اُردو افسانہ اس مارکسی نقطۂ نظر کو اپنے بیانیے میں سمو کر پیش کرتا ہے جہاں کہانیوں کے کردار غربت کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے اپنی معصومیت کھو دیتے ہیں اور محنت کی چکی میں پس کر بڑے ہو جاتے ہیں مگر علم سے محرومی ان کی قسمت بنی رہتی ہے۔

بین فاوکس لکھتے ہیں:

> "In its blind unrestrainable passion, its werewolf hunger for surplus labour, capital usurps not only the working adult but also the child. It pulls the worker's family into its servitude, forcing even the youngest members to toil beyond their strength. The capitalist system, indifferent to the physical and mental well-being of the labouring class, exploits them from childhood, reducing their lives to mere instruments of production, robbing them of education, health, and the joys of youth".
>
> —Karl Marx, Capital: Volume 1

(ترجمہ: اپنی اندھی، بے لگام ہوس میں، اپنی اضافی محنت کی بھیڑیائی بھوک میں، سرمایہ نہ صرف بالغ مزدور کو بلکہ بچے کو بھی اپنے تسلط میں لے لیتا ہے۔ یہ محنت کش کے پورے خاندان کو اپنی غلامی میں دھکیل دیتا ہے، حتیٰ کہ سب سے کم عمر افراد کو بھی ان کی طاقت سے زیادہ مشقت کرنے پر مجبور کر دیتا ہے۔ سرمایہ دارانہ نظام، مزدور طبقے کی جسمانی اور ذہنی صحت کی پروا کیے بغیر، ان کا بچپن سے ہی استحصال کرتا ہے، ان کی زندگیوں کو محض پیداوار کے اوزار میں تبدیل کر دیتا ہے، انہیں تعلیم، صحت اور بچپن کی خوشیوں سے محروم کر دیتا ہے"۔(۱)

جدید اُردو افسانہ چائلڈ لیبر کے ساتھ ساتھ بچوں کے تعلیمی استحصال کو بھی اُجاگر کرتا ہے۔ ان کہانیوں میں دیکھا جاسکتا ہے کہ کیسے نچلے طبقے کے بچے مناسب تعلیمی سہولیات سے محروم رہتے ہیں اور اگر تعلیم حاصل بھی کرتے ہیں تو وہ صرف ایک مخصوص حد تک محدود ہوتی ہے جو انھیں مزدوری کے دائرے سے باہر نکلنے نہیں دیتی۔ اس حوالے سے جدید افسانہ ایک پیچیدہ اور حقیقت پسندانہ بیانیہ پیش کرتا ہے جہاں معاشرتی ناہمواری صرف محنت اور سرمایہ دار کے درمیان نہیں بلکہ تعلیم اور جہالت کے درمیان بھی نظر آتی ہے۔

جدید افسانے میں بچوں کے معاشی اور تعلیمی استحصال کی عکاسی نہ صرف حقیقت پسندی کے تحت ہوتی ہے بلکہ اس میں فلسفیانہ اور نفسیاتی پہلو بھی شامل کیے جاتے ہیں۔ بچوں کے جذباتی کرب، ان کی ٹوٹی ہوئی امیدوں اور ان کے معصوم خوابوں کو جدید افسانہ نگار بڑی ہنر مندی سے بیان کرتے ہیں۔ بعض افسانوں میں چائلڈ لیبر کو ایک خوفناک حقیقت کے طور پر پیش کیا گیا ہے جہاں بچے اپنے بچپن سے محروم ہو جاتے ہیں اور بڑی عمر کے افراد کی طرح زندگی گزارنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ دیگر افسانوں میں اسے ایک علامتی انداز میں بیان کیا گیا ہے، جہاں چائلڈ لیبر صرف ایک جسمانی مشقت کا نام نہیں بلکہ ایک ایسے سماجی جبر کی علامت بن جاتا ہے جو طبقاتی تقسیم کو مزید گہرا کرتا ہے۔

شعیب خالق کے افسانے "چالیس روپے" سے اقتباس ملاحظہ ہو:

> "لچھے بیچنے والا یہ گنگ دماغ لڑکا پچھلے ڈیڑھ ماہ سے سیٹلائٹ ٹاؤن کی مارکیٹ میں جوتوں کی ایک دکان کے برآمدے والے شیلف کے سامنے بیٹھ کر گھنٹوں ایک جوتے کو ٹکٹکی باندھے دیکھتا چلا آرہا تھا۔ وہ ہر روز سکول کے گیٹ پر ہاف بریک کی گھنٹی بجتے ہی اپنے ہاتھوں میں پکڑی ننھی سی گھنٹی زور زور سے ہلاتا اور شور مچانے لگتا۔
>
> لچھے جی لچھے، بڑے مزیدار لچھے۔۔۔۔
>
> پھر شروع میں لڑکوں کا ایک ریلہ آتا اور اس سے لچے لے کر کھاتا 'شور مچاتا 'ادھر ادھر بھاگنے لگتا 'لیکن بعد میں وہ آہستہ آہستہ گھنٹی بجاتا۔ سیدھا مارکیٹ میں جوتوں کی دکان کے سامنے آبیٹھتا اور پھر وہیں بیٹھے بیٹھے بچے کھچے لچھے بھی بیچتا اور ربڑ کے اس جوتے کو بھی دیکھتا رہتا جو چمکتے ہوئے چمڑے سے بنایا گیا معلوم ہوتا تھا"۔(۲)

جدید اُردو افسانہ اس بات کا گواہ ہے کہ اکیسویں صدی میں چائلڈ لیبر اور بچوں کے تعلیمی استحصال کا مسئلہ نہ صرف بر قرار ہے بلکہ مزید پیچیدہ شکل اختیار کر چکا ہے۔ ترقی پسند تحریک سے لے کر آج کے افسانے تک، یہ موضوع مختلف جہتوں سے پیش کیا گیا ہے مگر اس کی جڑیں اب بھی سرمایہ دارانہ استحصال میں پیوست ہیں جس کی وضاحت کارل مارکس نے بہت پہلے کر دی تھی۔ جدید افسانہ نگار اس استحصال کو محض دکھانے تک محدود نہیں رہتے بلکہ وہ اس کے سماجی اور نظریاتی اسباب پر بھی روشنی ڈالتے ہیں تاکہ قاری ان کہانیوں کو محض بیانیہ نہ سمجھے بلکہ ایک زندہ حقیقت کے طور پر دیکھے، جسے بدلنے کی ضرورت ہے۔

ا۔ معاصر اُردو افسانے میں بچوں کے تعلیمی معاشی محرکات:

اُردو افسانہ ہمیشہ سے انسانی سماج کی پیچیدگیوں، تضادات اور ناانصافیوں کا آئینہ رہا ہے۔ جدید اُردو افسانہ نگاری میں بچوں کے تعلیمی اور معاشی استحصال کا مسئلہ نہایت سنجیدگی سے زیرِ بحث آیا ہے۔ یہ مسئلہ بنیادی طور پر معاشی ناہمواریوں، جاگیر داری، سرمایہ داری اور معاشرتی بے حسی کے نتیجے میں جنم لیتا ہے۔ ترقی پسند تحریک کے تحت لکھے گئے افسانے اس مسئلے کو شدت سے اُجاگر کرتے رہے ہیں، جبکہ بیسویں اور اکیسویں صدی کے جدید افسانہ نگاروں نے اسے ایک نئے تناظر میں پیش کیا ہے۔ خاص طور پر طاہرہ اقبال، نیلوفر اقبال اور شعیب خالق کے افسانے بچوں کے تعلیمی اور معاشی مسائل کو حقیقت پسندانہ اور مؤثر انداز میں بیان کرتے ہیں۔

سرمایہ دارانہ نظام اور جاگیر داری ڈھانچہ بچوں کو تعلیمی مواقع سے محروم کر کے انہیں سستے مزدور کے طور پر استعمال کرتا ہے۔ کارل مارکس کے نظریہ کے مطابق، سرمایہ دارانہ معیشت میں محنت کش طبقے کا استحصال ناگزیر ہے اور اس استحصال میں بچے بھی شامل ہو جاتے ہیں۔ سرمایہ دارانہ ڈھانچے میں بچے اپنی کمزوری اور مجبوری کے سبب سب سے زیادہ متاثر ہوتے ہیں۔ شعیب خالق کے افسانے "۴۰ روپے" اور "ایک نوکر کی کہانی" اس حقیقت کو نمایاں کرتے ہیں کہ غربت کے باعث بچوں کو سکول کی بجائے محنت مزدوری پر لگا دیا جاتا ہے۔ سید محمد حسن لکھتے ہیں:

> "محنت کش طبقے کے بچے جب کم عمری میں ہی مشقت کا شکار ہو جاتے ہیں تو وہ اپنے تخلیقی اور فکری امکانات سے محروم کر دیے جاتے ہیں۔ سرمایہ دارانہ نظام انہیں محض

ایک مشین کا پرزہ بنا دیتا ہے جو صرف پیداوار میں اضافہ کا ذریعہ ہوتا ہے، نہ کہ ایک آزاد اور باشعور انسان"۔(۳)

افسانہ "۴۰ روپے" ایک ایسے بچے کی کہانی ہے جو معمولی اُجرت کے عوض سخت محنت کرتا ہے۔ کہانی کا المیہ یہ ہے کہ اس کی تمام تر محنت کے باوجود وہ بنیادی ضروریات پوری نہیں کر پاتا اور اس کا تعلیمی خواب چکنا چور ہو جاتا ہے۔ یہ افسانہ سرمایہ داری کے اس بے رحم پہلو کو اجاگر کرتا ہے جس میں غریب کا بچہ سستی محنت کی منڈی میں جھونک دیا جاتا ہے۔ اسی طرح "ایک نوکر کی کہانی" میں مصنف بچوں کے استحصال کی دردناک تصویر کشی کرتا ہے۔ یہ کہانی ان بچوں کے بارے میں ہے جنہیں کم عمری میں گھریلو نوکر بنا دیا جاتا ہے اور وہ اپنے خوابوں اور تعلیم کی قربانی دے کر دوسروں کی خدمت میں مصروف ہو جاتے ہیں۔ شعیب خالق کا یہ افسانہ طبقاتی تقسیم اور سرمایہ دارانہ نظام کی ناانصافیوں کو نمایاں کرتا ہے۔

طاہرہ اقبال کے افسانے بچوں کے تعلیمی استحصال کے سماجی، نفسیاتی اور اقتصادی عوامل پر روشنی ڈالتے ہیں۔ ان کے افسانوں میں غربت اور محرومی کا ایسا بیانیہ ملتا ہے جو قاری کو جھنجھوڑ کر رکھ دیتا ہے۔ نیلوفر اقبال نے بھی اپنے افسانوں میں بچوں کی محرومیوں کو نہایت مؤثر انداز میں پیش کیا ہے۔ ان کے کردار زندگی کی تلخیوں سے نبرد آزما نظر آتے ہیں مگر ان کے لیے نکلنے کا کوئی راستہ نہیں ہوتا۔

جدید اُردو افسانے میں چائلڈ لیبر اور تعلیم کے درمیان کشمکش کو بنیادی موضوع کے طور پر اپنایا گیا ہے۔ جہاں ترقی پسند تحریک کے دوران احمد ندیم قاسمی، کرشن چندر اور سعادت حسن منٹو نے طبقاتی فرق کو اُجاگر کیا ہے وہیں جدید دور کے افسانہ نگاروں نے اس مسئلے کو مزید گہرائی میں جا کر پیش کیا گیا ہے۔ تعلیم ہر بچے کا بنیادی حق ہے مگر غربت اور سرمایہ دارانہ جبر کے سبب لاکھوں بچے تعلیم سے محروم رہ کر مزدوری پر مجبور ہیں۔

اس ضمن میں شعیب خالق کے افسانے کا اقتباس پیشِ نظر ہے:

"پھر اس نے روز آٹھ آٹھ آنے چاچا کی نظروں سے چھپاتے چھپاتے جمع کیے اور آج صبح لچھے بیچنے کے لیے جاتے ہوئے ایک دکاندار سے اپنی ریزگاری کے بدلے دس دس کے نوٹ لیے تھے، وہاں سے وہ سکول آیا اور بریک بگھتا کر مارکیٹ کی طرف تیزی کے

ساتھ جاتے ہوئے اسے یک دم اپنے چالیس روپوں کے گم ہونے کا خیال چاچا کے
زناٹے دار تھپڑ کی طرح محسوس ہوا اور اس کا سارا وجود جیسے لمحہ بھر کو سن ہو گیا"۔(۴)

اُردو افسانہ معاشرتی ناہمواریوں کا ایک سچا دستاویز ہے اور اس میں بچوں کے تعلیمی اور معاشی استحصال کو ہمیشہ سنجیدگی سے لیا گیا ہے۔ شعیب خالق، طاہرہ اقبال اور نیلوفر اقبال جیسے افسانہ نگاروں نے اپنے فن کے ذریعے اس اہم مسئلے کی نشاندہی کی ہے۔ چائلڈ لیبر نہ صرف ایک سماجی مسئلہ ہے بلکہ یہ ایک ایسا المیہ ہے جو معاشرے کی اخلاقی بنیادوں کو کھوکھلا کر دیتا ہے۔ اُردو افسانہ اس استحصال کے خلاف ایک مزاحمتی آواز کے طور پر ابھرتا ہے اور قاری کو سوچنے پر مجبور کرتا ہے کہ آخر کب تک ہمارے معصوم بچے تعلیم کی بجائے مزدوری کرنے پر مجبور رہیں گے؟ ڈاکٹر علی محمد صدیقی لکھتے ہیں:

"ترقی پسند ادب کا بنیادی مقصد سماجی ناانصافیوں کے خلاف آواز بلند کرنا ہے۔ چائلڈ لیبر اور بچوں کی تعلیمی محرومی سرمایہ دارانہ اور جاگیر داری نظام کی وہ سچائیاں ہیں جنھیں ادب نے ہمیشہ نمایاں کیا ہے۔ ایک ایسا معاشرہ جہاں بچے تعلیم کے بجائے مزدوری پر مجبور ہوں وہ دراصل اپنے ہی مستقبل کو تاریکی میں دھکیل رہا ہوتا ہے۔ ترقی پسند افسانہ نگاروں نے ان مسائل کو اجاگر کر کے یہ ثابت کیا کہ سماجی انقلاب صرف نعرے سے نہیں بلکہ عملی شعور بیدار کرنے سے آتا ہے"۔(۵)

نفسیاتی حوالے سے دیکھا جائے تو الفریڈ ایڈلر کا "انفرادی نفسیات" (Individual Psychology) کا نظریہ اس مسئلے کو بہتر طور پر واضح کرتا ہے۔ ایڈلر کے مطابق ہر انسان میں کمتر ہونے کا احساس (Inferiority Complex) موجود ہوتا ہے اور وہ اس احساس پر قابو پانے کے لیے جدوجہد کرتا ہے۔ چائلڈ لیبر کے شکار بچے اس نفسیاتی دباؤ کا شدید شکار ہوتے ہیں کیونکہ وہ دوسرے بچوں کو سکول جاتے دیکھ کر اپنی کم مائیگی اور بے بسی کا شکار ہو جاتے ہیں۔ ان کا تعلیمی استحصال ان کی شخصیت پر گہرے اثرات مرتب کرتا ہے جس کے نتیجے میں ان میں خود اعتمادی کی کمی اور احساسِ محرومی جنم لیتا ہے۔ ایڈلر کا یہ بھی ماننا تھا کہ انسان کی شخصیت اس کے ابتدائی تجربات سے تشکیل پاتی ہے اور اگر کسی بچے کو کم عمری میں سخت حالات اور استحصال کا سامنا ہو تو وہ معاشرتی طور پر ایک غیر محفوظ، کمزور اور دباؤ کا شکار شخصیت میں ڈھل سکتا ہے۔ شعیب خالق کے افسانے "۴۰ روپے" اور "ایک نوکر کی کہانی" کے کردار ایڈلر کے نظریہ کی واضح مثال ہیں،

کیونکہ یہ بچے مسلسل احساسِ کمتری اور محرومی کا شکار رہتے ہیں جس کا اثر ان کی ذہنی نشوونما اور شخصیت پر دیرپا ہوتا ہے۔ اس حوالے سے درجِ ذیل نقاط اہم ہیں:

۱۔ غربت کے باعث بچے تعلیم سے محروم ہو جاتے ہیں اور مزدوری پر مجبور ہوتے ہیں۔

۲۔ سرمایہ دارانہ اور جاگیر داری نظام بچوں کا معاشی استحصال کرتا ہے اور ان کے بنیادی حقوق سلب کر لیتا ہے۔ مسلسل مشقت اور محرومی کے باعث بچوں میں احساسِ کمتری اور مایوسی پیدا ہوتی ہے۔

۳۔ خاندانی مسائل اور معاشی دباؤ کی وجہ سے والدین بھی بچوں کو تعلیم کے بجائے مزدوری کی طرف دھکیل دیتے ہیں۔

۴۔ طبقاتی فرق کے سبب غریب بچے مزدوری کی چکی میں پس جاتے ہیں جبکہ امیر طبقے کے بچے جدید تعلیم حاصل کرتے ہیں۔

شعیب خالق کے افسانوں "۴۰ روپے" اور "ایک روپیہ روزانہ" میں بچوں کے تعلیمی اور معاشی مسائل نمایاں طور پر سامنے آتے ہیں۔ افسانے "ایک روپیہ روزانہ" سے اقتباس ملاحظہ ہو:

> "جس دن سکول داخلے کے لیے جانا تھا اس سے پہلی شام وہ نالا کرنگ گئے اور چھوٹو کو انھوں نے صابن کی پوری ٹکیا رگڑ کر ختم کرنے کو کہا اور ساتھ خود بھی نہائے آخری رات عینکو ڈیرے پر سب سے مضطرب اور چوکنا ہونے کے باعث ساری رات سو بھی نہ سکا سارے پیسے ایک روپیہ روزانہ والی تھیلی میں بند اور سکول تک وہ تھیلی اس نے سنبھال کر رکھنی تھی وہ تینوں صاف سانسوں میں الجھے سو رہے تھے اور اگلے دن کا سورج ان کے اندر سکول کا طلوع بن کر جاگ رہا تھا"۔(۶)

غربت کے باعث بچے اسکول جانے کے بجائے محنت مزدوری پر مجبور ہو جاتے ہیں جس کی وجہ سے ان کی تعلیمی ترقی رک جاتی ہے۔ سرمایہ دارانہ اور جاگیر داری نظام کے تحت بچوں کو کم اُجرت پر طویل محنت کرنی پڑتی ہے جس سے ان کے بنیادی حقوق سلب ہو جاتے ہیں۔ بچپن میں مسلسل مشقت اور محرومی کے باعث ان بچوں میں احساسِ کمتری، خود اعتمادی کی کمی اور مایوسی جنم لیتی ہے۔ کم عمر بچے اپنے گھروں کے معاشی مسائل حل کرنے کے لیے کام کرتے ہیں جبکہ والدین بھی مجبوری کے تحت انہیں تعلیم کے بجائے مزدوری کی

طرف دھکیل دیتے ہیں۔ امیر اور غریب کے درمیان بڑھتا ہوا فرق ان بچوں کو مزید مشکلات میں دھکیل دیتا ہے جہاں ایک طرف کچھ بچے جدید تعلیم حاصل کر رہے ہوتے ہیں، وہیں غریب بچے مزدوری کی چکی میں پس رہے ہوتے ہیں۔ یہ نکات شعیب خالق کے افسانوں میں بچوں کے تعلیمی اور معاشی حالات کو حقیقی انداز میں پیش کرتے ہیں اور سماجی ناہمواری کی نشاندہی کرتے ہیں۔

حمزہ حسن شیخ کے افسانے "چاکلیٹ" میں بچوں کی نفسیات کا بھرپور جائزہ لیا گیا ہے۔ بچے چونکہ معصوم ہوتے ہیں انھیں اس بات کا علم نہیں ہوتا کہ انھیں لالچ اور دھوکہ سے کتنا بڑا نقصان بھی ہو سکتا ہے۔ اس افسانے میں ایک ملازم کی اپنے مالک سے وفاداری بیان کی گئی ہے کہ وہ اپنے مالک کے کتے کو اپنے بچے پر زیادہ ترجیح دیتا ہے۔ کتے کو کھلائی جانے والی چاکلیٹ اپنے بچے کو بھی نہیں دیتا حالانکہ بچہ بڑی حسرت سے اپنے باپ سے چاکلیٹ کا مطالبہ کرتا رہتا ہے:

> "یہ بات اُس کے لیے مہم بھی اور چاکلیٹ نہ ملنے یہ اُس کا دل بجھ جاتا۔ وہ ہمیشہ ایک فاصلے سے کتے کا مشاہدہ کرتا، خاص کر جب وہ غصے میں ہوتا اور پھر جب اس کو چاکلیٹ دی جاتیں تو اس کا غصّہ ٹھنڈا ہو جاتا۔ چاکلیٹ کھاتا کتا ہمیشہ اُس کے دل میں حسد کی چنگاریاں سُلگا دیتا اور وہ زیادہ طیش کھانے لگتا۔ جیسے دن گزرے، چاکلیٹ کے لیے اُس کی اشتہا بڑھ گئی اور اب وہ تمام چاکلیٹ کھانا چاہتا تھا جو مالک نے اُس کو چکھائی تھیں لیکن غریب باپ اپنے بچے کو خراب نہیں کرنا چاہتا تھا کہ اگر یہ چاکلیٹ کھانے کا عادی ہو گیا اور بعد میں اُسے یہ نوکری چھوڑنی پڑ گئی تو پھر وہ اُس کی خواہش کیسے پوری کر پائے گا"۔(۷)

باپ اپنے موقف میں درست تھا لیکن چھوٹا ارسلان ایسی تمام پابندیاں سمجھنے سے قاصر تھا۔ جیسے جیسے دن گزر رہے تھے، وہ کتے کا اپنے بدترین دشمن کے طور پر مشاہدہ کر رہا تھا۔ جب کبھی بھی کتا چاکلیٹ کھاتا وہ کچھ فاصلے سے اُس کا منہ چڑاتا یا کبھی کبھار اپنا غصہ نکالنے کے لیے اُس کو تھپڑ مارنے کا اشارہ کرتا لیکن کتے نے کبھی بھی اُس کے کسی عمل پر ردعمل ظاہر نہیں کیا تھا۔

حمزہ حسن شیخ کے افسانے "تڑکا" میں بچوں کے تعلیمی اور معاشی استحصال کو گہرے نفسیاتی زاویوں سے پیش کیا گیا ہے۔ یہ کہانی رائٹ (Right) کے نقطہ نظر سے واضح کرتی ہے کہ بچوں کو بنیادی تعلیمی اور معاشی

حقوق سے محروم کرنا صرف ایک سماجی ناانصافی نہیں بلکہ ان کی شخصیت کی نشوونما پر بھی گہرے منفی اثرات مرتب کرتا ہے۔ نفسیاتی حوالے سے دیکھا جائے تو بچہ جب مسلسل مزدوری اور استحصال کا شکار رہتا ہے تو اس میں محرومی، خوف اور احساسِ کمتری پیدا ہو جاتا ہے جو اس کی آئندہ زندگی پر گہرے اثرات چھوڑتا ہے۔ حمزہ حسن شیخ نے "تڑکا" میں دکھایا ہے کہ جب بچے اپنی عمر کے مطابق زندگی گزارنے سے قاصر ہوں تو وہ لاشعوری طور پر یا تو ایک باغی ذہنیت اختیار کر لیتے ہیں یا ایک مستقل شکست خوردہ شخصیت میں ڈھل جاتے ہیں۔ یہ کہانی طبقاتی فرق کو بھی نمایاں کرتی ہے جہاں ایک طرف کچھ بچے جدید تعلیم حاصل کر رہے ہوتے ہیں، وہیں دوسری طرف وہ بچے ہیں جو غربت کے شکنجے میں جکڑے ہوئے مزدوری کر رہے ہوتے ہیں۔ محمد ابراہیم کے مطابق:

> "سرمایہ دارانہ استحصال کی سب سے بھیانک شکل وہ ہے جہاں کمزور اور بے بس بچوں سے ان کے خواب چھین لیے جاتے ہیں۔ مزدوری پر مجبور کیا جانے والا ہر بچہ دراصل ایک مردہ خواب کی مانند ہوتا ہے جس کی آنکھوں میں علم کی روشنی کے بجائے محرومی اور مشقت کی دھول بھری جاتی ہے۔ ایسے بچے جب بڑے ہوتے ہیں تو ان کے ذہن میں صرف بقا کی جدوجہد ہوتی ہے، تخلیقیت اور جستجو کی نہیں۔ یہ استحصال صرف انفرادی سطح پر نہیں بلکہ پورے معاشرے کی فکری پسماندگی کا باعث بنتا ہے"۔(۸)

حمزہ حسن شیخ کے افسانے "تڑکا" میں بچوں کے تعلیمی اور معاشی استحصال کو گہرے نفسیاتی زاویوں سے پیش کیا گیا ہے۔ یہ کہانی رائٹ (Right) کے نقطۂ نظر سے واضح کرتی ہے کہ بچوں کو بنیادی تعلیمی اور معاشی حقوق سے محروم کرنا صرف ایک سماجی ناانصافی نہیں بلکہ ان کی شخصیت کی نشوونما پر بھی گہرے منفی اثرات مرتب کرتا ہے۔ نفسیاتی حوالے سے دیکھا جائے تو بچہ جب مسلسل مزدوری اور استحصال کا شکار رہتا ہے تو اس میں محرومی، خوف اور احساسِ کمتری پیدا ہو جاتا ہے جو اس کی آئندہ زندگی پر گہرے اثرات چھوڑتا ہے۔ حمزہ حسن شیخ نے "تڑکا" میں دکھایا ہے کہ جب بچے اپنی عمر کے مطابق زندگی گزارنے سے قاصر ہوں تو وہ لاشعوری طور پر یا تو ایک باغی ذہنیت اختیار کر لیتے ہیں یا ایک مستقل شکست خوردہ شخصیت میں ڈھل جاتے ہیں۔ یہ کہانی طبقاتی فرق کو بھی نمایاں کرتی ہے، جہاں ایک طرف کچھ بچے جدید تعلیم حاصل کر رہے ہوتے ہیں، وہیں دوسری طرف وہ بچے ہیں جو غربت کے شکنجے میں جکڑے ہوئے مزدوری کر رہے ہوتے ہیں۔

فرائیڈ کے نظریے کے مطابق، بچپن کے تجربات انسانی نفسیات کی تشکیل میں بنیادی کردار ادا کرتے ہیں۔ اگر ایک بچہ مسلسل دباؤ، استحصال اور عدم تحفظ کا شکار رہے تو اس کے لاشعور میں خوف اور بے بسی کی کیفیت راسخ ہو جاتی ہے۔ فرائیڈ کی نظریہ شخصیت (Psychoanalytic Theory of Personality) کے مطابق ایسے بچے اپنی زندگی میں دو طرح کی نفسیاتی کیفیات کا شکار ہو سکتے ہیں۔ یا تو وہ بچپن کے تجربات کو دبا دیتے ہیں اور ان کا اظہار مستقبل میں کسی اور طرح، جیسے جارحیت یا احساسِ محرومی کی صورت میں کرتے ہیں یا وہ کم اعتمادی اور خود ترسی کا شکار ہو کر زندگی کو ایک مستقل جدوجہد سمجھنے لگتے ہیں۔ اس افسانے میں دکھایا گیا ہے کہ مزدوری کرنے والے بچے اپنے جذبات کو دبانے پر مجبور ہوتے ہیں اور یوں ان کے لاشعور میں مسلسل عدم تحفظ کا احساس پروان چڑھتا ہے جو ان کی شخصیت پر دیرپا اثرات مرتب کرتا ہے۔

بچوں کے معاشی استحصال کا براہِ راست تعلق سماجی ڈھانچے اور معاشی نظام سے ہے۔ جن معاشروں میں طبقاتی تفریق زیادہ ہوتی ہے وہاں چائلڈ لیبر اور استحصال کے امکانات بھی بڑھ جاتے ہیں۔ غربت، ناخواندگی اور سماجی ناہمواری بچوں کو کم سنی میں مزدوری پر مجبور کرتی ہے جس سے نہ صرف ان کی معصومیت مجروح ہوتی ہے بلکہ ایک پوری نسل تعلیمی، ذہنی اور جسمانی طور پر پسماندگی کا شکار ہو جاتی ہے۔ یہ استحصال صرف انفرادی سطح پر نقصان دہ نہیں بلکہ ایک سماجی مسئلہ بھی ہے کیونکہ کم عمری میں مشقت کرنے والے بچے بڑے ہو کر اسی نظام کا حصہ بنتے ہیں جو انھیں دائرے میں قید رکھتا ہے۔

یہ اقتباس پیئر بوردیو کی کتاب "Reproduction in Education, Society and Culture" سے لیا گیا ہے، جس کا اُردو ترجمہ بعنوان "تعلیم، سماج اور ثقافت میں تولید" کے نام سے ہوا ہے۔ اس ترجمہ میں بوردیو نے واضح کیا ہے کہ کس طرح تعلیمی نظام سماجی ناہمواریوں کو تقویت دیتا ہے اور طبقاتی فرق کو برقرار رکھتا ہے۔ ارشاد حسن لکھتے ہیں:

> "تعلیمی نظام بظاہر میرٹ پر مبنی ہوتا ہے لیکن درحقیقت یہ سماجی ڈھانچے کی ناہمواریوں کو برقرار رکھنے کا ایک ذریعہ ہے۔ یہ نظام اعلیٰ طبقاتی ثقافتی سرمائے کو ترجیح دیتا ہے جس سے نچلے طبقوں کے بچوں کے لیے ترقی کے مواقع محدود ہو جاتے ہیں"۔(۹)

اس حوالے سے مارکسی نظریہ ایک جامع وضاحت پیش کرتا ہے۔ کارل مارکس کے مطابق، سرمایہ دارانہ نظام محنت کش طبقے کو دباتا ہے اور مزدوروں کے استحصال کو فروغ دیتا ہے۔ مارکسی نقطۂ نظر کے مطابق

چائلڈ لیبر محض ایک اخلاقی یا سماجی مسئلہ نہیں بلکہ سرمایہ دارانہ نظام کی ناانصافی کا لازمی نتیجہ ہے۔ اس نظریے کے تحت محنت کش طبقے کے بچے اس لیے مزدوری پر مجبور ہوتے ہیں کیونکہ سرمایہ دارانہ معیشت میں دولت چند ہاتھوں میں مرکوز ہو جاتی ہے اور مزدور طبقے کو مناسب وسائل میسر نہیں آتے۔ نتیجتاً، چائلڈ لیبر نہ صرف ایک مالیاتی مسئلہ ہے بلکہ ایک سیاسی اور معاشرتی ڈھانچے کا مسئلہ بھی ہے۔

اُردو افسانے کے فروغ میں کئی موضوعات ایسے ہیں جو بچوں کے معاشی استحصال کے ساتھ منسلک ہیں۔ مثال کے طور پر "سماجی حقیقت نگاری" کا رجحان اس مسئلے کو براہ راست اُردو افسانے میں جگہ دیتا ہے۔ ترقی پسند تحریک کے افسانہ نگاروں نے چائلڈ لیبر کو بطور مرکزی موضوع پیش کیا اور اس کے خلاف آواز بلند کی۔ سعادت حسن منٹو، کرشن چندر اور عصمت چغتائی جیسے افسانہ نگاروں نے چائلڈ لیبر کو معاشرتی بے حسی اور سرمایہ دارانہ استحصال کے آئینے میں دکھایا۔

علاوہ ازیں، جدید اُردو افسانے میں چائلڈ لیبر کے ساتھ ساتھ "شناخت کے بحران" کا موضوع بھی ابھر کر سامنے آیا ہے۔ وہ بچے جو کم عمری میں مزدوری پر مجبور ہوتے ہیں، ان کی شناخت مزدور، نوکر یا مشقت کرنے والے کے طور پر بن جاتی ہے جبکہ ان کے خواب اور تعلیمی صلاحیتیں پس منظر میں چلی جاتی ہیں۔ جدید اُردو افسانہ نگاروں نے اس پہلو کو بھی نمایاں کیا ہے جہاں بچوں کے استحصال کو ان کی نفسیاتی الجھنوں اور سماجی پسماندگی کے تناظر میں دیکھا گیا ہے۔ یوں اُردو افسانے میں چائلڈ لیبر محض ایک سماجی مسئلہ نہیں بلکہ ایک گہرے معاشرتی بحران کی نشاندہی کرتا ہے جو مارکس کے سرمایہ دارانہ استحصال، سماجی حقیقت نگاری اور شناختی بحران کے موضوعات کے ساتھ جڑا ہوا ہے۔

فرائیڈ کے نظریہ نفسیاتی ترغیب (Psychosexual Development) کے مطابق اگر کسی فرد کے بچپن کی بنیادی ضروریات پوری نہ ہوں تو وہ اپنی توانائیاں صحت مند نشوونما کے بجائے غیر صحت مند نفسیاتی رویوں میں ضائع کر دیتا ہے۔ اس لحاظ سے معاشی استحصال بچوں کی شخصیت کو نہ صرف موجودہ دور میں متاثر کرتا ہے بلکہ ان کی پوری زندگی پر اس کے اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ شہزاد احمد لکھتے ہیں۔

> "معاشی اور تعلیمی استحصال صرف بچوں تک محدود نہیں رہتا بلکہ پوری نسل کی فکری اور تخلیقی بنیادیں کمزور کر دیتا ہے۔ ایڈلر کے مطابق، بچپن میں محرومی کا سامنا کرنے والے افراد احساسِ کم تری کا شکار ہو جاتے ہیں، جبکہ بوردیو کے 'ثقافتی سرمایہ' کے تصور

کے تحت، ایسے بچے سماجی عدم مساوات کا مستقل حصہ بن جاتے ہیں۔ نتیجتاً، یہ استحصال صرف انفرادی نقصان نہیں بلکہ سماج کے فکری اور معاشی زوال کا سبب بنتا ہے"۔(۱۰)

مریم مجید ڈار کے افسانے "لفافے کی موت" میں بچوں کے تعلیمی اور معاشی استحصال کو گہرے سماجی پس منظر میں پیش کیا گیا ہے۔ اس افسانے میں غربت، بے بسی اور طبقاتی فرق کو نمایاں کرتے ہوئے ان معاشی عوامل کی وضاحت کی گئی ہے جو بچوں کی نفسیات پر گہرے اثرات مرتب کرتے ہیں۔ بنیادی طور پر یہ افسانہ اس حقیقت کو اُجاگر کرتا ہے کہ جب بچے بنیادی ضروریات سے محروم ہوتے ہیں تو ان کی شخصیت اور مستقبل کے امکانات شدید متاثر ہوتے ہیں:

مریم مجید ڈار کے افسانے "لفافے کی موت" سے اقتباس ملاحظہ ہو:

"خیر! میں واپس اس منظر کو لوٹتا ہوں جہاں لفافے بن رہے ہیں۔۔۔۔ "کمبختو! جلدی ہاتھ چلاؤ!" ماں کے زنگ آلود قینچی سے ردی اخبارات کاٹتے ہاتھوں نے ذرا دیر کو اپنا کام روکا اور پاس بیٹھے بلو کی کمر میں دھموکا جڑا جو لئی سے لتھڑی انگلیاں لئے بجائے لفافہ جوڑنے کے کٹے ہوئے کاغذ پہ بنی کسی اشتہا انگیز خوراک کو یوں گھورے جا رہا تھا مانو ابھی کسی معجزے سے یہ خوراک اخبار سے نکل کر اس کے سامنے آن پڑے گی۔ دھموکے کے جھٹکے سے اس کی خمیدہ کمر کسی شاخ کی طرح لچکی اور وہ تندہی سے کٹے ہوئے اخبار کو لفافے کی شکل دینے لگا۔ "کاکے! یہ کھیپ سوکھ جائے تو سیٹھ کو یہ سارے لفافے دے آنا! ماں نے اخبار کی آخری گڈی کو کاٹتے ہوئے مجھے کہا اور میں دل ہی دل میں سخت تلملایا کہ ابھی چلچلاتی دوپہر میں تو میں نے لئی تیار کی تھی اور اب ایک بار پھر سے ان لفافوں کا بوجھ کمر پہ اٹھائے دھوپ سے بھری گلیاں عبور کر کے سیٹھ کی ہٹی تک جانا ہو گا"۔(۱۱)

اس افسانے میں نمایاں ہونے والے معاشی محرکات میں سب سے اہم محرک طبقاتی تقسیم ہے جو غریب بچوں کو تعلیم سے دور رکھتی ہے اور انہیں مزدوری پر مجبور کرتی ہے۔ دوسرا بڑا عنصر مالی عدم استحکام ہے جو والدین کو بچوں کی تعلیم کے بجائے روزگار کو ترجیح دینے پر مجبور کرتا ہے۔ تیسرا محرک خاندانی دباؤ اور سماجی جبر ہے جو بچوں کے خوابوں اور اُمنگوں کو دبا دیتا ہے۔ چوتھا عنصر وہ نفسیاتی دباؤ ہے جو مسلسل محرومی کے باعث

بچوں میں احساسِ کمتری کو جنم دیتا ہے جس کے نتیجے میں ان کا اعتماد اور خودی متاثر ہوتی ہے۔ پانچواں محرک تعلیمی مواقع کی عدم دستیابی ہے جو بچوں کے لیے آگے بڑھنے کے راستے مسدود کر دیتی ہے اور انھیں محرومی کے ایک مستقل دائرے میں قید کر دیتی ہے۔ مریم مجید ڈار کے اس افسانے میں نہ صرف غربت اور طبقاتی فرق کا المیہ بیان کیا گیا ہے بلکہ ان نفسیاتی اثرات پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے جو ایک بچے کی ذہنی نشوونما کو متاثر کرتے ہیں۔ یہ کہانی اس حقیقت کو بھی اُجاگر کرتی ہے کہ جب بچوں کو بنیادی تعلیم اور بہتر مواقع فراہم نہیں کیے جاتے، تو وہ صرف ایک فرد کی ناکامی نہیں ہوتی بلکہ پورے معاشرے کا زوال بن جاتی ہے۔

مریم مجید ڈار کا افسانہ "لفافے کی موت" اپنی روایتی اُردو افسانوی ساخت کے ساتھ آگے بڑھتا ہے جہاں بیانیہ سادہ مگر گہرائی لیے ہوتا ہے۔ ان کے اس افسانے میں زبان و بیان کی خاص بات یہ ہے کہ وہ غیر ضروری پیچیدگیوں سے گریز کرتے ہوئے سادہ مگر موثر اسلوب اپناتی ہیں۔ جملوں کی ساخت میں روانی اور تسلسل موجود ہوتا ہے جس کی بدولت قاری آسانی سے متن سے جڑ جاتا ہے۔ ان کے افسانے میں منظر نگاری اور کرداروں کی نفسیاتی پیچیدگی کو اُجاگر کرنے کے لیے مختصر مگر بامعنی جملے استعمال کیے گئے ہیں۔ مکالموں میں فطری پن نمایاں ہے، جو کرداروں کے حالات اور جذبات کو براہِ راست قاری تک پہنچاتے ہیں۔ ان کی تحریر میں سماجی حقیقت نگاری کا عنصر نمایاں ہے جہاں طبقاتی فرق اور استحصال کو زبان کی سادگی اور تخلیقی انداز میں بیان کیا جاتا ہے۔ ان کے اسلوب میں ایک غیر محسوس ادبی جمالیات موجود ہے جو روایتی اور جدید افسانوی بیانیے کے امتزاج سے ایک منفرد آہنگ پیدا کرتی ہے۔ سلیم آغا قزلباش کے مطابق:

> "ادبی زبان محض اظہار کا ذریعہ نہیں بلکہ ایک تخلیقی عمل ہے، جو حقیقت کو نئی معنویت عطا کرتا ہے۔ زبان جب اپنی قدرتی فصاحت اور فکری تہہ داری کے ساتھ استعمال کی جاتی ہے تو وہ محض الفاظ کا مجموعہ نہیں رہتی بلکہ ایک ذہنی، جمالیاتی اور حسی تجربہ بن جاتی ہے۔ بہترین ادبی زبان وہی ہے جو زندگی کے اسرار کو نہ صرف بیان کرے بلکہ انہیں محسوس بھی کرائے"۔(۱۲)

جدید اُردو افسانے کے اسالیب کئی جہتوں میں بٹے ہوئے ہیں جہاں مختلف نظریات اور فکری مکاتبِ فکر کی جھلک نظر آتی ہے۔ نفسیاتی اسلوب میں کرداروں کی داخلی کیفیات، شعور کی رو، لاشعور کی پرتیں اور نفسیاتی پیچیدگیاں نمایاں رہتی ہیں۔ یہ اسلوب جدید نفسیاتی تحقیقات خصوصاً سگمنڈ فرائیڈ، کارل یونگ اور ایڈلر

کے نظریات سے متاثر ہے جہاں کردار اپنے اعمال کے پیچھے چھپے محرکات سے آگاہ ہونے یا ان سے بے خبر رہنے کے بیچ الجھے دکھائی دیتے ہیں۔ اس کے برعکس، تمثیلی اور علامتی اسلوب میں کہانیوں کو ایک گہرے فلسفیانہ رنگ میں ڈھالا جاتا ہے جہاں ہر کردار اور ہر واقعہ کسی نہ کسی بڑے سماجی یا فلسفیانہ نکتے کی نمائندگی کرتا ہے۔ ترقی پسند تحریک کے افسانہ نگاروں نے خاص طور پر علامتی انداز میں طبقاتی کشمکش، استحصال اور آزادی کے تصورات کو بیان کیا۔

جدید اُردو افسانے میں تجریدیت بھی نمایاں ہے، جہاں کہانی کو روایتی بیانیے سے آزاد کر کے محض احساسات، کیفیات اور تصوراتی مناظر کے ذریعے پیش کیا جاتا ہے۔ اس میں منطق اور حقیقت پسندی سے زیادہ مجرد خیالات کو اہمیت دی جاتی ہے۔ تاریخی اور سیاسی اسلوب میں استعماری طاقتوں کے خلاف جدوجہد، آزادی کے بعد کی صورتِ حال اور سماجی و سیاسی بحران جیسے موضوعات کو افسانوی بیانیے کا حصّہ بنایا گیا۔ اس کے ساتھ ہی، مابعد جدیدیت اور مابعد نو آبادیاتی اسلوب نے کہانی کے ڈھانچے کو مزید پیچیدہ بنا دیا جہاں حقیقت اور فکشن کی سرحدیں دھندلا جاتی ہیں اور زبان، ثقافت اور شناخت جیسے بنیادی سوالات کو کہانی کے اندر نئی شکل میں پیش کیا جاتا ہے۔

جدید افسانے میں دیہی اور شہری زندگی کے امتزاج کا بھی ایک منفرد اسلوب سامنے آیا جس میں دیہاتی معصومیت اور شہری زندگی کی پیچیدگیوں کو ایک ساتھ پیش کیا گیا۔ کئی افسانہ نگاروں نے دیہات سے شہروں کی طرف ہجرت، روزگار کے مسائل اور بدلتے ہوئے سماجی رویوں کو مرکزی حیثیت دی۔ اس کے علاوہ، جدید دور میں سائنس اور ٹیکنالوجی کے اثرات کو بھی کہانیوں میں شامل کیا گیا جہاں سائنسی ترقی کے انسانی زندگی پر اثرات اور مشینوں کے ساتھ بڑھتے ہوئے تعلق کو افسانوی بیانیے کا حصّہ بنایا گیا۔ وجودیت اور فلسفیانہ اسلوب میں انسانی بے بسی، تنہائی اور زندگی کے بے معنی ہونے کے خیالات کو موضوع بنایا گیا جہاں کردار ایک ایسی دنیا میں قید نظر آتے ہیں جو ان کے لیے کوئی راستہ فراہم نہیں کرتی۔ اس کے مقابلے میں مابعد الطبیعاتی اور روحانی اسلوب میں تصوف، ماورائیت اور دنیا کی حقیقت سے آگے کی جستجو کو کہانیوں کا موضوع بنایا گیا جہاں کردار کسی غیر مرئی حقیقت کو پانے کی کوشش کرتے نظر آتے ہیں۔

معاشی استحصال کی شکلیں بھی ہر دور میں تبدیل ہوئیں۔ ایک وقت تھا جب زمینداری نظام کے تحت بچے کھیتوں میں محنت کرتے تھے پھر صنعتی انقلاب کے بعد فیکٹریوں میں کم اُجرت پر مزدور بن گئے۔ آج کے

دور میں جدید چائلڈ لیبر ٹیکنالوجی اور ڈیجیٹل معیشت کے ذریعے بھی ظاہر ہوتی ہے جہاں بچے کم اُجرت پر کام کرنے یا مجبوری میں روزگار اختیار کرنے پر مجبور ہوتے ہیں۔ اُردو افسانے نے ان تمام تبدیلیوں کو اپنے بیانیے میں جگہ دی ہے۔ کبھی براہِ راست حقیقت پسندی کے ذریعے اور کبھی علامتی انداز میں۔

معاصر اُردو افسانہ نگاروں، جیسے مریم مجید ڈار، طاہرہ اقبال اور شعیب خالق نے اپنے افسانوں میں چائلڈ لیبر کے جدید پہلوؤں کو اُجاگر کیا ہے۔ ان کے بیانیے میں نہ صرف بچوں کے معاشی استحصال کو بیان کیا گیا ہے بلکہ اس کے نفسیاتی اثرات کو بھی موضوع بنایا گیا ہے جہاں بچے اپنی شناخت اور خوابوں سے محروم ہو کر صرف ایک مشین کا حصہ بن جاتے ہیں۔ یہ بدلتے ہوئے اسالیب اس بات کی نشاندہی کرتے ہیں کہ اُردو افسانہ صرف ایک عہد کا عکس نہیں بلکہ مسلسل ارتقاپذیر حقیقت کا بیانیہ ہے۔

۲۔ معاصر اُردو افسانے میں بچوں کی تعلیمی اور معاشی استحصال کی صورتیں:

بچوں کے تعلیمی اور معاشی استحصال کا موضوع اُردو افسانے میں گہرے سماجی شعور کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ موثر افسانہ ان مسائل کو محض بیانیہ انداز میں بیان نہیں کرتا بلکہ علامتی اور نفسیاتی سطح پر بھی ان کا احاطہ کرتا ہے۔ سادہ بیانیہ میں بچوں کے مسائل کو براہِ راست اور حقیقت پسندی کے ساتھ بیان کیا جاتا ہے جہاں غربت، جبری مشقتاور تعلیمی مواقع کی کمی جیسے پہلوؤں کو اُجاگر کیا جاتا ہے۔ یہ افسانے عام طور پر ایسے کرداروں کے گرد گھومتے ہیں جو کم عمری میں ہی روزگار کی سختیوں کا شکار ہو جاتے ہیں، یا جنھیں تعلیم حاصل کرنے کے بجائے کام پر لگا دیا جاتا ہے۔

دوسری جانب، علامت نگاری کے ذریعے یہ استحصال زیادہ گہرائی کے ساتھ سامنے آتا ہے۔ بچوں کی معصومیت کو کچلنے والے عناصر، ان کے خوابوں کی ٹوٹ پھوٹ اور معاشرتی ناہمواریوں کو ایسے استعاروں اور علامتوں کے ذریعے پیش کیا جاتا ہے جو قاری کے ذہن پر دیرپا اثر چھوڑتی ہیں۔ نفسیاتی عوامل کے تحت یہ افسانے بچوں کے اندر پیدا ہونے والی بے بسی، خوف اور دباؤ کو بھی ظاہر کرتے ہیں جس سے یہ استحصال ایک داخلی کرب کی صورت میں نمایاں ہوتا ہے۔ اس طرح معاصر اُردو افسانہ بچوں کے تعلیمی اور معاشی استحصال کو صرف ایک مسئلہ نہیں بلکہ ایک گہری معاشرتی حقیقت کے طور پر پیش کرتا ہے جو سماجی ناانصافی اور طبقاتی تفریق کی ایک واضح علامت بن جاتا ہے۔

جدید اُردو افسانہ معاشی استحصال کی تلخ حقیقتوں کو اُجاگر کرتا ہے، جہاں سرمایہ دارانہ جبر اور جاگیر دارانہ ظلم انسانی زندگی کو کچل دیتا ہے۔ مزدور طبقہ دن بھر مشقت کے باوجود بنیادی سہولیات سے محروم رہتا ہے اور کم اُجرت کے ساتھ سخت محنت اسے مزید استحصال کا شکار بناتی ہے۔ خالد اقبال لکھتے ہیں:

> "جب تک ہمارے سماجی رویے بچوں کو محض ایک مددگار ہاتھ سمجھنے کی سوچ سے باہر نہیں آئیں گے، تب تک ان کا معاشی استحصال جاری رہے گا۔ ہمیں یہ تسلیم کرنا ہوگا کہ ہر بچہ تعلیم، کھیل اور خوشی کا اتنا ہی حقدار ہے جتنا کوئی دوسرا فرد۔ اگر ہم اپنی سوچ بدلیں، تو ایک ایسا معاشرہ تشکیل پا سکتا ہے جہاں بچپن مشقت کے بوجھ سے آزاد ہو"۔(۱۳)

بے روزگاری ایک ایسا زہر ہے جو تعلیم یافتہ نوجوانوں کے خوابوں کو چکنا چور کر دیتا ہے۔ جدید افسانہ اس المیے کو گہرائی سے بیان کرتا ہے جہاں محض ڈگریاں حاصل کرنا کافی نہیں بلکہ روزگار کے حصول میں دربدر بھٹکنا ان کا مقدر بن جاتا ہے۔ بچوں کا تعلیمی استحصال سرمایہ دارانہ نظام کی سب سے ظالمانہ شکل ہے جہاں غربت کے باعث انھیں کتابوں کے بجائے اوزار تھما دیے جاتے ہیں۔ اُردو افسانے میں یہ المیہ صرف ایک کہانی نہیں بلکہ معاشرتی زخم کی صورت میں ابھرتا ہے، جو مسلسل گہرا ہوتا جا رہا ہے۔ جاگیر دارانہ نظام کی جڑیں گہری ہیں جہاں کسان نسل در نسل قرضوں میں جکڑے رہتے ہیں۔ جدید اُردو افسانہ اس نظام کے ظالمانہ پہلوؤں کو نمایاں کرتا ہے، جہاں زمین کا مالک، مزدور کی محنت کو اپنی ملکیت سمجھتا ہے اور کسان کا پسینہ ہمیشہ قرض کی مٹی میں جذب ہو جاتا ہے۔

عورت کا معاشی استحصال دوہرا ہے—ایک طرف اسے مرد مزدور کے مقابلے میں کم اُجرت ملتی ہے اور دوسری طرف ہراسانی اور عدم تحفظ کے سائے میں جینا پڑتا ہے۔ اُردو افسانہ ان مسائل کو نہ صرف بیان کرتا ہے بلکہ ان کی سنگینی کو بھی نمایاں کرتا ہے۔ ہجرت ایک ایسا دکھ ہے جو روزگار کی تلاش میں شہروں کا رخ کرنے والے دیہاتیوں کی زندگیوں میں شامل ہو جاتا ہے۔ جدید افسانے میں یہ پہلو اس درد کے ساتھ اُبھرتا ہے جہاں ایک طرف شہروں کی چکاچوند ہے اور دوسری طرف گلیوں میں سونے والے محنت کش جو فٹ پاتھ پر پڑے رہنے کو اپنی قسمت سمجھتے ہیں۔

سرمایہ دارانہ نظام میں مزدور محض ایک مشین بن کر رہ جاتا ہے جس کی کوئی شناخت نہیں ہوتی۔ جدید افسانہ اس بے بسی اور اجنبیت کے احساس کو نمایاں کرتا ہے، جہاں کام کی جگہوں پر طویل اوقات کار، غیر انسانی سلوک اور بنیادی سہولیات کی کمی مزدوروں کو صرف زندہ رہنے کے لیے کام کرنے پر مجبور کر دیتی ہے۔

شعیب خالق کے افسانے ان تمام مسائل کو ایک گہرے کرب کے ساتھ پیش کرتے ہیں جہاں کرداروں کی بے بسی اور زندگی کی تلخی قاری کو جھنجھوڑ کر رکھ دیتی ہے۔ ان کے ہاں سماج کے پسے ہوئے طبقے کی جدوجہد اور استحصال کی کہانیاں محض بیانیہ نہیں، بلکہ ایک تلخ حقیقت کے آئینے کی مانند ہیں جو قاری کو سوچنے پر مجبور کرتی ہیں کہ کس طرح سے بچوں کا تعلیمی استحصال ہوتا ہے۔

اس حوالے سے درجِ ذیل اقتباس ملاحظہ ہو:

"شفیقا، رحیما اور چھوٹو اعینکو کو بہت پیچھے چھوڑ دوڑتے گئے مگر جب عینکو نے رکھ کر تھیلی ہاتھ میں پکڑ ہوا میں بلند کر کے انھیں دکھاتے ہوئے لہرائی اور چیخ کر کہا "بچے جاؤ پیسے تو یہ میرے پاس ہیں" وہ بھاگتے بھگاتے رکے اور پلٹ کر ان تینوں نے ایک بھیانک منظر دیکھا عینکو کا ہاتھ اور تھیلی ابھی ہوا میں لہرا رہے تھے کہ اس کا لنگڑا باپ سائیکل پر بیٹھے تیزی کے ساتھ اس کے قریب پہنچ کر تھیلی اچک سائیکل بجلی کی تیزی سے دوڑتا اگلا موڑ مڑ گیا عینکو دل حلق میں روکے روتا چیختا اور گالیاں دیتا اس کے پیچھے بھاگنے لگا۔ وہ تینوں جو اس سے خاصے فاصلے پر تھے جب سڑک کے موڑ تک واپس پہنچے تو انہیں صرف عینکو بھاگتا نظر آیا اور سائیکل سوار کہیں دکھائی نہ دیا وہ پاگلوں کی طرح عینکو کے پیچھے گرتے پڑھتے دوڑتے گئے مگر پھر ایک اور موڑ مڑا انھوں نے دیکھا تو عینکو بھی اوجھل ہو چکا تھا چھوٹو ادھر ہی سڑک پر لیٹ تڑپنے اور ایڑیاں رگڑنے لگا دھاڑیں مار مار روتے ہوئے وہ ایک ہی جُملہ دوہراتا ہائے میرا سکول ہائے میرا سکول ہائے میرا سکول۔۔۔۔"۔(۱۴)

ڈاکٹر مرزا حامد بیگ لکھتے ہیں:

"اکیسویں صدی نے ان تمام رویوں کو اپنے اندر مدغم کیا ہے جو نفسیاتی تحریکوں کی وجہ سے منظر عام پر آئے تھے۔ فرائیڈ اور یونگ کے نظریات نے ہمارے ادب کو بھی خاصا

متاثر کیا ہے۔ ادب میں ترقی پسند تحریک نے جن موضوعات کو تخلیقی ادب بنایا بنیادی طور پر وہ اپنے فلسفے میں مستحکم طور پر اگے نہیں بڑھ پائی لیکن نفسیات کا یہ رخ ادب کے تمام حلقوں پر غالب آرہا ہے"۔(۱۵)

نئے لکھنے والوں نے ۲۱ویں صدی میں عالمی ادب کے رجحانات کو گہرائی سے محسوس کیا اور انھیں اپنے افسانوں میں مختلف تجرباتی انداز میں پیش کیا۔ اس صدی میں جہاں انسانی حقوق، آزادی اور مساوات جیسے موضوعات پر بات کی جارہی ہے، وہیں جدید اُردو افسانہ بھی اپنے اندر ایک نئی فکری بیداری پیدا کر چکا ہے۔ خاص طور پر بچوں کے معاشرتی اور معاشی استحصال کا موضوع ان تحریروں میں شدت سے ابھرا ہے۔

جدید اُردو افسانہ اس تلخ حقیقت کو نمایاں کرتا ہے کہ بچے جو کسی بھی قوم کا مستقبل ہوتے ہیں۔ اکثر سماج میں سب سے زیادہ نظر انداز کیے جاتے ہیں۔ ان کے استحصال کی مختلف صورتیں ہیں، جن میں غربت، جبری مشقت، تعلیمی مواقع کی کمیاور ذہنی و جسمانی تشدد شامل ہیں۔ جدید افسانہ اس استحصال کو صرف بیانیہ انداز میں پیش نہیں کرتا بلکہ ان بچوں کی داخلی دنیا میں اتر کر ان کے نفسیاتی کرب کو بھی سامنے لاتا ہے۔ یہ بات واضح ہے کہ ادب محض حقیقت کی تصویر کشی کا نام نہیں بلکہ وہ قاری کو ایک خاص زاویے سے سوچنے پر مجبور بھی کرتا ہے۔ نئے اُردو افسانہ نگاروں نے بچوں کی دنیا کو محض ظاہری مشقت تک محدود نہیں رکھا بلکہ اس کے گہرے نفسیاتی اثرات کو بھی پیش کیا ہے۔ ایک ایسا بچہ جو تعلیم سے محروم ہو جس کا بچپن محنت کی سختیوں میں گزرے، وہ صرف جسمانی طور پر ہی نہیں بلکہ ذہنی اور جذباتی طور پر بھی متاثر ہوتا ہے۔ اس کی تخلیقی صلاحیتیں دب جاتی ہیں، اس کی شخصیت عدم تحفظ کا شکار ہو جاتی ہے اور وہ دنیا کو ایک مختلف زاویے سے دیکھنے لگتا ہے۔

اکیسویں صدی کے جدید افسانے میں بچوں کی نفسیات کو سمجھنے کے لیے ان کے خوف، خواب اور محرومیوں کو مرکزی حیثیت دی گئی ہے۔ ایک ایسا بچہ جو دن بھر کسی ہوٹل میں برتن دھوتا ہے یا کسی فیکٹری میں کام کرتا ہے، اس کے ذہن میں کیا خیالات ہوتے ہیں؟ وہ اپنی زندگی کو کس نظر سے دیکھتا ہے؟ کیا وہ اپنے حال کو قبول کر چکا ہے یا اس کے اندر کوئی بغاوت پنپ رہی ہے؟ یہ سوالات جدید افسانہ نگاروں کے لیے بنیادی اہمیت رکھتے ہیں۔

اس کے ساتھ ساتھ بچوں کے استحصال کو محض ذاتی المیہ کے طور پر پیش کرنے کے بجائے ایک اجتماعی سماجی مسئلے کے طور پر بھی دیکھا جارہا ہے۔ سرمایہ دارانہ نظام، طبقاتی فرق اور جاگیر داری جیسے عناصر بچوں کے خوابوں کو کچلنے میں بڑا کردار ادا کرتے ہیں۔ جدید اُردو افسانہ ان محرومیوں کی تصویر کشی کے ساتھ ساتھ ان کے سماجی و سیاسی پس منظر کو بھی نمایاں کرتا ہے۔ اکیسویں صدی میں عالمی ادب میں بھی بچوں کے حقوق پر خاصی توجہ دی جارہی ہے اور اُردو افسانہ اس رجحان سے متاثر ہو کر مزید گہرائی اختیار کر رہا ہے۔ آج کا اُردو افسانہ ایک آئینہ ہے جو سماج کے کمزور اور پسے ہوئے طبقات، خاص طور پر بچوں کی محرومیوں اور ان کی نفسیاتی کشمکش کو اجاگر کر کے قاری کو سوچنے پر مجبور کر دیتا ہے۔ یہ محض کہانیاں نہیں بلکہ ہمارے اجتماعی ضمیر کے سوالات ہیں جو اس وقت تک گونجتے رہیں گے جب تک بچوں کو ایک بہتر زندگی فراہم نہیں کی جاتی۔

یونگ کے نظریۂ اجتماعی لاشعور میں "آرکیٹائپس" ایک بنیادی حیثیت رکھتے ہیں جو انسانی ذہن میں ازلی اور غیر شعوری تصورات کی شکل میں موجود ہوتے ہیں۔ ان آرکیٹائپس میں بچے کی معصومیت، کمزوری اور فطری نیکی جیسے تصورات بھی شامل ہیں۔ یہ انسانی لاشعور میں نسل در نسل منتقل ہوتے رہتے ہیں اور مختلف ثقافتوں میں مختلف شکلوں میں ظاہر ہوتے ہیں۔ جدید نفسیات اور ادب میں بچے کے آرکیٹائپ کو ایک ایسے علامتی استعارے کے طور پر دیکھا جاتا ہے جو زندگی، امید اور مستقبل کی نمائندگی کرتا ہے لیکن جب یہ آرکیٹائپ کسی بحران یا جبر کا شکار ہوتا ہے تو یہ سماج کے لیے ایک بڑا سوال بن جاتا ہے۔ شہزاد احمد لکھتے ہیں

> "اجتماعی لاشعور میں موجود بچے کے آرکیٹائپ کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ ہم ان تمام سماجی عوامل کا جائزہ لیں جو اس کی نشوونما پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ بچے فطرتاً معصوم ہوتے ہیں لیکن اگر وہ کسی ایسی فضا میں پروان چڑھیں جہاں انھیں ذہنی، جذباتی یا جسمانی استحصال کا سامنا ہو تو ان کا شعور ایک ایسی شکل اختیار کر لیتا ہے جو فطری آرکیٹائپ سے مختلف ہوتی ہے"۔(۱۶)

جدید سماجی اور ادبی مطالعات میں اس بات کو شدت سے محسوس کیا گیا ہے کہ بچوں کا استحصال صرف انفرادی المیہ نہیں بلکہ ایک اجتماعی بحران ہے جو پوری نسل کے شعور پر اثر انداز ہوتا ہے۔ معاشرتی سطح پر اگر دیکھا جائے تو بچوں کا استحصال ایک تاریخی حقیقت ہے جو مختلف شکلوں میں ہمیشہ موجود رہا ہے۔

انسانی حقوق اور بچوں کے استحصال کے حوالے سے حمزہ حسن شیخ اپنے افسانے "نوٹ بُک" میں آرمی پبلک سکول کے ایک ایسے ہی واقعہ کو بیان کرتے ہیں جس میں انسانی حقوق کو پامال کرتے ہوئے بے گناہ بچوں پر بزدلانہ حملہ کیا گیا جس کے نتیجے میں شہید کر دیے گئے۔ نوٹ بُک کو موضوع بناتے ہوئے وہ لکھتے ہیں کہ:

> "ابھی میں اپنی زندگی کے بارے میں سوچ ہی رہی تھی کہ کلاس روم میں دوڑتے قدموں کی آواز سنائی دی، یک لخت مشین گنوں کی گھن گرج گونجنے لگی اور ان کے منہ سے آگ برسنے لگے۔ کلاس میں ہر جانب سرخ رنگ پھیل گیا اور ساری دیواریں اور چھت سرخی رنگ کے واٹر کلر سے اَٹ گئیں۔ چیخ و پکار کانوں کو پھاڑنے لگی اور بچے ادھر ادھر دوڑنے لگے جبکہ میرے دوست نے اپنا سر مجھ پر رکھ دیا جیسے وہ کبھی کبھار گھر میں سوتا تھا۔ یہ پہلی دفعہ تھا کہ وہ کلاس میں اس طرح مجھ پر سویا تھا۔ سونے کے ساتھ ساتھ وہ ایک تصویر بھی بنا رہا تھا جس کے رنگ تیزی سے میرے جسم پر پھیل رہے تھے"۔(۱۷)

صنعتی انقلاب کے بعد دنیا میں بچوں کے معاشی استحصال میں غیر معمولی اضافہ ہوا۔ کارل یونگ کا نظریہ بتاتا ہے کہ انسانی لاشعور میں موجود اجتماعی تجربات کسی نہ کسی صورت میں نسل در نسل منتقل ہوتے رہتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آج بھی دنیا کے مختلف خطوں میں بچے جبری مشقت، تعلیمی استحصال اور عدم تحفظ جیسے مسائل کا شکار ہیں۔ ان مسائل کو روکنے کے لیے صرف قانون سازی کافی نہیں بلکہ سماجی شعور میں ایک بنیادی تبدیلی ضروری ہے تاکہ بچے کو محض ایک معاشی ذریعہ نہ سمجھا جائے بلکہ ایک ایسے فرد کے طور پر تسلیم کیا جائے جو زندگی کی فطری نشوونما کا حق رکھتا ہے۔

بچوں کے معاشی استحصال کو روکنے کے لیے سب سے اہم قدم تعلیمی مواقع کی فراہمی ہے۔ تعلیم وہ بنیادی ذریعہ ہے جو کسی بھی فرد کو شعوری آزادی فراہم کرتا ہے اور اسے اس قابل بناتا ہے کہ وہ اپنی زندگی کے فیصلے خود کر سکے۔ کئی تحقیقات یہ ثابت کر چکی ہیں کہ وہ معاشرے جہاں بچوں کی تعلیم کو ترجیح دی جاتی ہے وہاں استحصال کی شرح کم ہوتی ہے۔ تعلیم کے بغیر کوئی بھی بچہ اپنی زندگی کے فیصلے کرنے کے قابل نہیں ہوتا اور اکثر غربت کے باعث ایسے حالات میں پھنس جاتا ہے جہاں اس کا استحصال ناگزیر ہو جاتا ہے۔

دوسرا اہم پہلو معاشی پالیسیوں کی اصلاح ہے۔ بچوں کی مزدوری کا تعلق براہِ راست معاشی عدم استحکام سے جڑا ہوتا ہے۔ جب کسی گھرانے کی بنیادی ضروریات پوری نہیں ہوتیں تو بچے بھی مزدوری کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ یہ ایک ایسا سماجی مسئلہ ہے جو صرف قانون سازی سے حل نہیں ہو سکتا بلکہ اس کے لیے معاشی ترقی اور منصفانہ مواقع کی فراہمی ضروری ہے۔

تیسرا پہلو والدین اور سماجی شعور کی تربیت سے متعلق ہے۔ یونگ کے مطابق اجتماعی لاشعور میں موجود رویے نسل در نسل منتقل ہوتے ہیں۔ اگر والدین خود کسی ایسے سماج میں پلے بڑھے ہوں جہاں بچوں کو صرف ایک کام کرنے والے فرد کے طور پر دیکھا جاتا ہو تو وہی رویہ وہ اپنی نسلوں میں منتقل کریں گے۔ اس لیے ضروری ہے کہ والدین اور معاشرتی ادارے بچوں کے حقوق کے بارے میں شعور پیدا کریں تاکہ انہیں ایک مکمل فرد کے طور پر تسلیم کیا جائے نہ کہ محض ایک مزدور یا بوجھ سمجھا جائے۔

چوتھا پہلو نفسیاتی معاونت کا ہے۔ جو بچے استحصال کا شکار ہوتے ہیں، وہ ایک نفسیاتی بحران سے گزرتے ہیں۔ یونگ کے نظریے کے مطابق اگر کسی بچے کے آرکیٹائپ کو جبر اور ناانصافی کا سامنا ہو تو اس کے اثرات نہ صرف اس کی شخصیت پر بلکہ پورے معاشرے پر مرتب ہوتے ہیں۔ ایسے بچوں کو خصوصی نفسیاتی مدد فراہم کرنا ضروری ہے تاکہ وہ اپنے اندر پیدا ہونے والے خوف اور احساسِ محرومی پر قابو پا سکیں اور ایک صحت مند ذہن کے ساتھ زندگی گزار سکیں۔

یہ تمام عوامل اس بات کی طرف اشارہ کرتے ہیں کہ بچوں کے استحصال کو روکنے کے لیے صرف قوانین اور پالیسیاں کافی نہیں بلکہ سماجی رویوں میں بنیادی تبدیلی ضروری ہے۔ جب تک بچوں کو محض ایک ذمہ داری یا معاشی ذریعہ سمجھا جائے گا، تب تک ان کا استحصال جاری رہے گا۔ یونگ کے نظریے کے مطابق جب سماج اجتماعی طور پر کسی تصور کو بدلنے کا فیصلہ کرتا ہے تو وہ لاشعور میں ایک نئی راہ متعین کر دیتا ہے۔ یہی عمل اگر بچوں کے حقوق اور ان کے تحفظ کے حوالے سے کیا جائے تو ایک ایسے مستقبل کی بنیاد رکھی جا سکتی ہے جہاں ہر بچہ اپنی فطری صلاحیتوں کو آزادانہ طور پر پروان چڑھا سکے اور سماج کا ایک فعال اور بامقصد حصہ بن سکے۔ محمد اسحاق احمد لکھتے ہیں:

> "معاشرتی ڈھانچے کی بقا اسی میں ہے کہ بچوں کو ان کا حق دیا جائے نہ کہ ان کے معصوم ہاتھوں میں مزدوری کی زنجیریں ڈال دی جائیں۔ جب تک بچوں کا معاشی استحصال

جاری رہے گا۔ ایک منصفانہ اور متوازن سماج کا قیام ممکن نہیں۔ ضروری ہے کہ اس مسئلے پر مسلسل لکھا جائے، شعور اُجاگر کیا جائے اور سخت قوانین بنائے جائیں تاکہ ہر بچے کو محفوظ اور روشن مستقبل مل سکے"۔(۱۸)

مریم مجید ڈار کا افسانہ "لفافے کی موت" سماجی ڈھانچے کی ایک گہری اور تکلیف دہ عکاسی کرتا ہے جس میں وہ استحصالی نظام کے تحت پسے ہوئے طبقے، خاص طور پر بچوں کے معاشی استحصال کو نمایاں کرتی ہیں۔ یہ افسانہ نہ صرف بچوں کی محرومیوں کو بیان کرتا ہے بلکہ اس حقیقت کو بھی اُجاگر کرتا ہے کہ جب تک سماج کے بنیادی ڈھانچے میں تبدیلی نہیں آتی، معاشرتی ناانصافیوں کا سلسلہ جاری رہے گا۔

افسانے کی مرکزی کہانی ایک ایسے کردار کے گرد گھومتی ہے جو کم عمری میں ہی اپنے کندھوں پر ذمہ داریوں کا بوجھ اٹھانے پر مجبور ہے۔ لفافہ، جو یہاں علامتی طور پر زندگی کی سفاک حقیقتوں اور بچوں کی معصومیت کی موت کی نمائندگی کرتا ہے، محض ایک چیز نہیں بلکہ ایک استعارہ ہے جو ان گنت کہانیوں اور اذیتوں کو اپنے اندر سموئے ہوئے ہے۔ مریم مجید ڈار کے اس افسانے میں یہ پہلو واضح ہوتا ہے کہ بچوں کا استحصال کسی فرد کا ذاتی معاملہ نہیں بلکہ ایک سماجی مسئلہ ہے جو پوری ساخت کو کمزور کر دیتا ہے۔

معاشی استحکام کے حوالے سے مریم مجید ڈار کے ہاں کئی ایسے محرکات نظر آتے ہیں جو بچوں کے بہتر مستقبل کے لیے ضروری ہیں۔ سب سے پہلا محرک تعلیم ہے جسے وہ معاشی خوشحالی کی بنیاد قرار دیتی ہیں۔ افسانے میں دکھایا گیا ہے کہ کس طرح کم وسائل رکھنے والے بچے تعلیمی مواقع سے محروم رہتے ہیں اور ان کے لیے مزدوری ہی واحد راستہ بن جاتی ہے۔ جب کسی سماج میں بچوں کی تعلیم پر توجہ نہیں دی جاتی تو وہ مزدوری کے جبر میں پھنس جاتے ہیں اور یوں استحصال کا یہ سلسلہ نسل در نسل منتقل ہوتا رہتا ہے۔

دوسرا اہم عنصر خاندانی و سماجی شعور ہے۔ مریم مجید ڈار کی تحریر اس حقیقت کی نشاندہی کرتی ہے کہ اگر بچوں کے والدین خود تعلیم یافتہ اور باشعور نہ ہوں، تو وہ بھی اس استحصالی نظام کا حصہ بن جاتے ہیں اور اپنے بچوں کو اسی دائرے میں دھکیل دیتے ہیں۔ اس لیے ضروری ہے کہ سماجی شعور کو اس سطح تک بلند کیا جائے جہاں ہر فرد یہ سمجھے کہ بچوں کو مزدوری میں جھونکنا ان کے مستقبل کو تباہ کرنے کے مترادف ہے۔

اہم محرک مضبوط قانونی نظام ہے جو بچوں کے تحفظ کو یقینی بناتا ہے۔ افسانے میں بالواسطہ طور پر اس طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ قوانین کی غیر موجودگی یا ان پر عملدرآمد نہ ہونے کے باعث بچوں کا استحصال جاری

رہتا ہے۔ اگر کسی ملک میں بچوں کی جبری مزدوری کے خلاف سخت قوانین ہوں اور ان پر عمل بھی کیا جائے تو اس مسئلے پر قابو پایا جا سکتا ہے۔ سب سے اہم پہلو معاشی مواقع کی فراہمی ہے۔ مریم مجید ڈار کے افسانے میں یہ پہلو واضح ہوتا ہے کہ جب تک معاشی عدم مساوات ختم نہیں ہوتی، استحصال کا خاتمہ ممکن نہیں۔ ایسے گھرانے جہاں بنیادی سہولیات میسر نہیں، وہاں بچے مجبوری میں کام کرنے پر مجبور ہوتے ہیں۔ اگر سماج میں ایسے مواقع پیدا کیے جائیں جہاں والدین کو باعزت روزگار ملے تو بچوں کو بھی ایک بہتر زندگی میسر آ سکتی ہے۔ محمود احمد قاضی لکھتے ہیں:

> "لفافے کی موت" درحقیقت ایک ایسا المیہ ہے جو روزانہ بے شمار بچوں کے ساتھ پیش آتا ہے۔ یہ افسانہ نہ صرف بچوں کے معاشی استحصال کو دکھاتا ہے بلکہ اس سسٹم کی کمزوریوں کو بھی نمایاں کرتا ہے جو ان بچوں کو تحفظ دینے میں ناکام رہتا ہے۔ مریم مجید ڈار کا قلم اس سچائی کو بے نقاب کرتا ہے کہ جب تک تعلیم، سماجی شعور، مضبوط قوانین اور معاشی مواقع کو یقینی نہیں بنایا جاتا، استحصال کا یہ سفاک نظام یونہی چلتا رہے گا اور "لفافے" یوں ہی مرتے رہیں گے"۔(۱۹)

شعیب خالق کے افسانے معاشرتی حقیقت نگاری کا بہترین نمونہ ہیں، جن میں وہ معاشی استحصال کو محض ایک موضوع کے طور پر نہیں بلکہ ایک زندہ حقیقت کے طور پر پیش کرتے ہیں۔ ان کے افسانوں میں غربت کے بوجھ تلے دبے بچوں کی بے بسی نمایاں ہے، جہاں تعلیمی مواقع سے محرومی اور محنت مزدوری ان کی قسمت بنا دی جاتی ہے۔ شعیب خالق نہ صرف ان مسائل کو اُجاگر کرتے ہیں بلکہ ان کے پس پردہ عوامل کو بھی دکھاتے ہیں، جیسے طبقاتی فرق، سرمایہ دارانہ نظام کی بے رحمی اور والدین کی مجبوری جو بچوں کو تعلیم کے بجائے روزگار کے میدان میں دھکیل دیتی ہے۔ ان کے افسانوں میں ایک منفرد ڈرامائی سرپایا جاتا ہے جو قاری کو کرداروں کے ساتھ جوڑ دیتا ہے۔ ان کے بیانیے میں کشمکش اور جذباتی شدت ایسی مہارت سے گوندھی گئی ہوتی ہے کہ کہانی صرف پڑھنے کی چیز نہیں رہتی بلکہ محسوس کی جا سکتی ہے۔ کرداروں کی بے بسی، حالات کی ستم ظریفی اور غیر متوقع موڑ ان کے افسانوی اسلوب کو مزید پر اثر بناتے ہیں۔

حمزہ حسن شیخ کے افسانے بچوں کے استحصال کی ایک گہری اور تلخ تصویر پیش کرتے ہیں جس میں کم عمری میں ہی انہیں روزگار کے تلخ حقائق کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ ان کے افسانوں میں وہ بچے نظر آتے ہیں جو سکول

جانے کی عمر میں اینٹوں کے بھٹے پر کام کر رہے ہوتے ہیں، ہوٹلوں میں برتن دھو رہے ہوتے ہیں یا فیکٹریوں میں خطرناک مشینوں کے سامنے کھڑے اپنی زندگی گزار رہے ہوتے ہیں۔ وہ اپنے افسانوں کے ذریعے اس حقیقت کو نمایاں کرتے ہیں کہ کیسے یہ بچے اپنے خوابوں سے دستبردار ہو کر محض زندہ رہنے کی جدوجہد میں مصروف ہو جاتے ہیں۔ ان کے کردار سوالیہ نشان بن کر سامنے آتے ہیں جو قاری کو سوچنے پر مجبور کرتے ہیں کہ آیا یہ ظلم محض ایک فرد کا مسئلہ ہے یا پورے سماج کا المیہ۔ حمزہ حسن شیخ کا اندازِ بیان سادہ اور حقیقت پسندانہ ہے جو قاری کو کسی مصنوعی فضا میں لے جانے کے بجائے حقیقت کی سخت زمین پر کھڑا کر دیتا ہے۔

مریم مجید ڈار کے افسانے جذباتی گہرائی کے حامل ہیں، جہاں بچوں کے نفسیاتی پہلوؤں کو خاص اہمیت دی گئی ہے۔ ان کی کہانیوں میں جذباتی کشمکش، اُمید اور ناامیدی کی ملی جلی کیفیتاور ایک حساس بیانیہ ملتا ہے جو بچوں کے اندرونی جذبات کی پیچیدگیوں کو بے نقاب کرتا ہے۔ وہ دکھاتی ہیں کہ کیسے ایک نادان بچہ جس کے پاس کھیلنے کے دن ہیں، اپنی گھریلو مشکلات کو سمجھنے پر مجبور ہو جاتا ہے اور بچپن کا سکون کہیں کھو جاتا ہے۔ ان کے افسانوں میں معصومیت، خواب، خوف اور محرومیوں کا ایسا امتزاج ہے جو قاری کے دل میں براہِ راست اتر جاتا ہے۔ وہ بچوں کی نفسیات کو انتہائی باریکی سے گرفت میں لاتی ہیں جہاں ایک چھوٹے سے بچے کی اُمید، اس کی خوفزدہ آنکھیں یا اس کے سادہ سوالات پورے سماجی ڈھانچے پر ایک گہرا طنز بن جاتے ہیں۔ ان کے افسانے محض بیانیہ نہیں بلکہ بچوں کی جذباتی دنیا کی ایک کھڑکی ہیں جس سے جھانکنے پر قاری کو نظر آتا ہے کہ کس طرح ایک بچے کے جذبات اور خواب بالغوں کی دنیا کے سخت اُصولوں کی نذر ہو جاتے ہیں۔

ادب اور تعلیم کا باہمی تعلق ایک قدیم فکری بحث کا موضوع رہا ہے۔ تعلیم محض کتابی علم تک محدود نہیں بلکہ یہ ایک فکری اور سماجی عمل بھی ہے جو انسان کی سوچ، شناخت اور مستقبل کی تشکیل میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔ عالمی ادب میں کئی نظریات ایسے ملتے ہیں جو تعلیمی اُصولوں اور ان کے اثرات کو سمجھنے میں مدد دیتے ہیں۔ ان نظریات میں سب سے زیادہ نمایاں پاؤلو فریرے کا تصورِ تعلیم ہے جس میں وہ استحصالی تعلیمی نظام کی مخالفت کرتے ہوئے تعلیم کو ایک انقلابی سرگرمی قرار دیتے ہیں۔ اس تصور کے مطابق، تعلیم کا مقصد محض معلومات کی ترسیل نہیں بلکہ طالب علم میں شعور اور خود آگہی پیدا کرنا ہے تاکہ وہ اپنے معاشرتی حالات کو سمجھ سکے اور ان میں بہتری لا سکے۔ ادب میں اس نظریے کی جھلک جارج آرویل، کرشن چندر اور کئی دیگر لکھاریوں

کے کام میں دیکھی جاسکتی ہے جہاں تعلیم کو طاقت کے ایک ہتھیار کے طور پر دکھایا گیا ہے جو بعض اوقات معاشرتی جبر اور طبقاتی تقسیم کو برقرار رکھنے کا ذریعہ بن جاتی ہے۔ نسرین اکبر لکھتی ہیں:

> "جان ڈیوئی نے تعلیم کے حوالے سے ترقی پسند نظریہ پیش کیا، جس میں سیکھنے کو ایک متحرک اور عملی تجربہ قرار دیا گیا۔ وہ رسمی تعلیم کے بجائے عملی زندگی سے سیکھنے کے قائل تھے۔ ادب میں اس تصور کی نمائندگی مارک ٹوئن کے کرداروں کے ذریعے ہوتی ہے جہاں بچے قدرت اور اپنے سماجی تجربات سے سیکھتے ہیں، نہ کہ سخت گیر تعلیمی نظام سے۔ اُردو ادب میں اشفاق احمد اور بانو قدسیہ کے ہاں بھی یہ رجحان کھائی دیتا ہے جہاں کردار نصابی تعلیم سے زیادہ زندگی کے حقیقی تجربات کے ذریعے سیکھنے پر یقین رکھتے ہیں۔ یہ نظریہ تعلیم کو ایک زندہ عمل کے طور پر پیش کرتا ہے جو انسان کی ذاتی ترقی اور خود شناسی میں مدد دیتا ہے"۔(۲۰)

انتونیو گرامشی نے تعلیم کو ثقافتی ہیجمونی کے تناظر میں دیکھا جہاں حکمران طبقہ تعلیمی نظام کے ذریعے مخصوص نظریات کو فروغ دیتا ہے تاکہ سماجی ڈھانچے کو اپنی مرضی کے مطابق ڈھال سکے۔ ادب میں اس نظریے کی مثال ایلڈس ہکسلے کے Brave New World اور رے بریڈبری کے Fahrenheit 451 میں دیکھی جاسکتی ہے جہاں تعلیم اور معلومات پر ریاستی کنٹرول دکھایا گیا ہے۔ اُردو ادب میں بھی کئی کہانیاں ایسی ہیں جہاں تعلیمی نظام کو ایک استحصالی ہتھیار کے طور پر پیش کیا گیا ہے جہاں مخصوص طبقات کو علم سے محروم رکھا جاتا ہے تاکہ وہ طاقتور طبقے کے قابو میں رہیں۔

لیو ویگوتسکی کا نظریہ سماجی سیکھنے پر مبنی ہے جس میں یہ وضاحت کی گئی کہ تعلیم محض ایک فردی عمل نہیں بلکہ ایک سماجی سرگرمی بھی ہے، جہاں طالب علم اپنے ماحول، دوستوں اور معاشرتی روابط کے ذریعے زیادہ مؤثر طریقے سے سیکھتا ہے۔ چیخوف، دوستوفسکی اور ٹالسٹائی کے کردار اس نظریے کے عملی نمونے پیش کرتے ہیں جہاں تعلیم کتابوں کے بجائے سماجی تجربات سے حاصل کی جاتی ہے۔ اُردو ادب میں منٹو اور عصمت چغتائی کے افسانے اس تصور کے قریب آتے ہیں جہاں کردار اپنے اردگرد کے ماحول سے اثر قبول کرتے ہیں اور اپنی زندگی کے فیصلے اسی بنیاد پر کرتے ہیں۔

پیری بوردیو نے ثقافتی سرمایہ کے نظریے میں وضاحت کی کہ تعلیم صرف کتابی علم کا نام نہیں بلکہ یہ ایک ایسا سماجی عنصر ہے جو فرد کے طبقاتی پس منظر اور سماجی رتبے پر منحصر ہوتا ہے۔ اس نظریے کو ادب میں

چارلس ڈکنز اور رضیہ بٹ کے کرداروں میں واضح طور پر دیکھا جا سکتا ہے جہاں طبقاتی فرق تعلیم تک رسائی کو متاثر کرتا ہے اور بعض کردار تعلیمی مواقع نہ ملنے کی وجہ سے زندگی کی دوڑ میں پیچھے رہ جاتے ہیں۔ اُردو افسانے میں کئی مثالیں موجود ہیں جہاں تعلیمی نظام اور طبقاتی تفریق کے درمیان گہرا تعلق دکھایا گیا ہے اور یہ بتایا گیا ہے کہ تعلیم بعض اوقات ایک استحصالی قوت کے طور پر بھی کام کر سکتی ہے جو امیر اور غریب کے درمیان فرق کو مزید گہرا کر دیتی ہے۔

عالمی اور اُردو ادب میں تعلیمی نظریات کی جھلک دیکھنے سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ تعلیم نہ صرف علم کے فروغ کا ذریعہ ہے بلکہ ایک ایسا سماجی اور سیاسی عمل بھی ہے جو افراد اور معاشروں کی قسمت کا تعین کرتا ہے۔ ادب میں ان نظریات کی عکاسی مختلف طریقوں سے کی گئی ہے، جہاں کہیں تعلیم کو آزادی اور شعور کا ذریعہ دکھایا گیا ہے اور کہیں اسے طاقتور طبقے کے ایک استحصالی ہتھیار کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔ یہ نظریات اس حقیقت کو نمایاں کرتے ہیں کہ تعلیم محض کلاس روم میں ہونے والا عمل نہیں بلکہ یہ فرد کی شناخت، معاشرتی ڈھانچے اور عالمی فکر کو تشکیل دینے میں بنیادی کردار ادا کرتی ہے۔

بچوں کے تعلیمی اور معاشی استحصال کی صورتیں درج ذیل ہیں:

۱۔ جدید اُردو افسانے میں بچوں کے تعلیمی استحصال کو نمایاں کیا گیا ہے، جہاں غربت کے باعث انھیں اسکول چھوڑ کر مزدوری کرنے پر مجبور کیا جاتا ہے۔ تعلیمی مواقع میں عدم مساوات کو دکھایا گیا ہے، جہاں امیر بچوں کو اعلیٰ تعلیمی سہولیات میسر ہوتی ہیں جبکہ غریب بچے بنیادی تعلیم سے بھی محروم رہتے ہیں۔

۲۔ حمزہ حسن شیخ کے افسانے کم عمری میں مشقت کرنے والے بچوں کے المیے کو اُجاگر کرتے ہیں، جو اپنے تعلیمی خوابوں کی قربانی دے کر گھر کی معیشت کا بوجھ اٹھاتے ہیں۔

۳۔ شعیب خالق کے افسانوں میں تعلیمی اور معاشی استحصال کا امتزاج نظر آتا ہے جہاں غربت، طبقاتی فرق اور تعلیمی ناہمواری بچوں کے خوابوں کو توڑ دیتی ہے۔ نجی تعلیمی اداروں کی کاروباری حیثیت کو اُردو افسانے میں موضوع بنایا گیا ہے، جہاں تعلیم ایک مہنگی تجارت بن چکی ہے جس تک غریب طبقہ رسائی حاصل نہیں کر پاتا۔

۴۔ مریم مجید ڈار کے افسانے جذباتی اور نفسیاتی پہلوؤں کو نمایاں کرتے ہیں جہاں تعلیمی استحصال بچوں میں احساس کمتری، خوف اور بے بسی پیدا کرتا ہے۔

۵۔ بچوں پر تعلیمی دباؤ اور ذہنی بوجھ کو اُردو افسانہ نگاروں نے شدت سے محسوس کیا ہے، جہاں سخت گیر تعلیمی نظام انہیں ذہنی اور جسمانی مسائل سے دوچار کر دیتا ہے۔ جدید افسانے تعلیم میں صنفی ناہمواری کو بھی نمایاں کرتے ہیں، خاص طور پر لڑکیوں کے لیے تعلیمی مواقع محدود ہونے کا ذکر کئی کہانیوں میں نظر آتا ہے۔

۶۔ تعلیمی نظام کی فرسودگی پر بھی اُردو افسانہ نگاروں نے روشنی ڈالی ہے جہاں تخلیقی سوچ اور عملی مہارتوں کے بجائے رٹے بازی کو اہمیت دی جاتی ہے۔ اُردو افسانے میں ایسے کردار بھی نظر آتے ہیں جو تعلیم کے استحصالی نظام کے خلاف بغاوت کرتے ہیں اور تبدیلی کی اُمید دلاتے ہیں۔

حوالہ جات

۱۔ مارکس، کارل. سرمایہ (Capital: Volume 1). ترجمہ: بین فاوکس (Ben Fowkes)، پینگوئن بکس، لندن، ۱۹۷۶ء، ص ۳۶۴

۲۔ شعیب خالق، چالیس روپے، مشمولہ چھتری نما کہانیاں، رومیل ہاؤس آف پبلی کیشنز، راولپنڈی، ۲۰۱۹ء، ص ۵۳

۳۔ مارکس، سرمایہ (داس کیپیٹل)۔ مترجم: سید محمد حسن، نیشنل بک فاؤنڈیشن، لاہور، ۱۹۸۸ء، ص ۳۲۲

۴۔ شعیب خالق، ایک روپیہ روزانہ، ص ۸۰

۵۔ صدیقی، علی محمد، ڈاکٹر، ترقی پسند ادب اور سماجی حقیقت: ایک تجزیہ، سنگِ میل پبلیکیشنز، کراچی، ۲۰۰۵ء، ص ۵۷

۶۔ شعیب خالق، ایک روپیہ روزانہ، ص ۱۴۳

۷۔ حمزہ حسن شیخ، قیدی، نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد، ۲۰۲۵، ص ۵۹

۸۔ محمد ابراہیم، "معاشرتی ناانصافی اور بچوں کا استحصال"، ادب نامہ، شمارہ: جولائی ۲۰۲۳، لاہور، ص ۵۷

۹۔ بوردیو، پیئر، "تعلیم، سماج اور ثقافت میں تولید". مترجم: ارشاد حسن، علم و عرفان پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۹ء، ص ۱۹۰

۱۰۔ شہزاد احمد، "دماغ کی صورت گری"، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۵ء، ص ۱۱۲

۱۱۔ مریم مجید ڈار، لفافے کی موت، ص ۳۹

۱۲۔ سلیم آغا قزلباش، ڈاکٹر، "اُردو کے رجحانات"، کاروان ادب، لاہور، ۲۰۰۱ء، ص ۲۳۴

۱۳۔ خالد اقبال، سماجی رویے، ایک مطالعہ، علمی کتاب ہاؤس، لاہور، ۱۹۸۷ء، ص ۷۹

۱۴۔ شعیب خالق، ایک روپیہ روزانہ، ص ۱۵۸

۱۵۔ مرزا حامد بیگ، ڈاکٹر، اُردو افسانے کا منظر نامہ، الفیصل پبلشرز، ملتان، ۲۰۰۵ء، ص ۱۴۲

۱۶۔ شہزاد احمد، "دماغ کی صورت گری"، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۵ء، ص ۱۴۳

۱۷۔ حمزہ حسن شیخ، قیدی، ص ۲۸

۱۸۔ محمد اسحاق، سماجی زاویے، روزمانہ جنگ، سنڈے ایڈیشن، روزنامہ جنگ، لاہور، ۲۰۰۹ء، ص ۱۴
۱۹۔ محمود احمد قاضی، مریم مجید "لفافے کی موت، نالہ دل، بھیر پبلی کیشنز، بھیرہ، ۲۰۱۰ء، ص ۲۱۹
۲۰۔ نسرین اکبر، ادب اور سماجیات: تجزیاتی مطالعہ، ادب رنگ پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۶ء، ص ۱۹۷

باب چہارم:

معاصر اُردو افسانے میں بچوں کے جنسی استحصال

جدید اُردو افسانہ معاشرتی، نفسیاتی اور فلسفیانہ پہلوؤں کو اپنے اندر سموئے ہوئے ہے اور اس میں انسانی تجربات کے پیچیدہ مسائل کو بے حد باریکی سے پیش کیا جاتا ہے۔ جدید افسانے میں جنسی استحصال، خاص طور پر بچوں کے جنسی استحصال کے موضوع کو ایک سماجی حقیقت کے طور پر زیر بحث لایا گیا ہے جہاں یہ ظلم محض ایک انفرادی جرم نہیں بلکہ ایک وسیع تر سماجی، ثقافتی اور نفسیاتی مسئلہ کے طور پر سامنے آتا ہے۔

جدید اُردو ادب میں بچوں کے جنسی استحصال کے موضوعات کا ظہور اس حقیقت کا غماز ہے کہ یہ مسئلہ محض روایتی یا مخصوص طبقات تک محدود نہیں بلکہ ایک پیچیدہ اور ہمہ جہت مسئلہ ہے جو سماجی ناہمواری، طاقت کے غلط استعمال اور خاندانی و سماجی ڈھانچے کی کمزوریوں سے جڑا ہوا ہے۔ یہ افسانے اکثر اس سوال کو اٹھاتے ہیں کہ کس طرح گھریلو اور سماجی بندھن بعض اوقات ان مظالم کو چھپانے کا ذریعہ بن جاتے ہیں اور کیسے معاشرتی رویے اور نظریات ایک ایسی خاموشی کو جنم دیتے ہیں جو مظلوم کو مزید کمزور کر دیتی ہے۔

ادب میں ایسے موضوعات کا آنا دراصل جدید سماجی شعور کا عکاس ہے۔ بیسویں صدی کے آخر اور اکیسویں صدی کے آغاز میں اُردو افسانہ زیادہ حقیقت پسند اور نفسیاتی گہرائیوں کو چھونے لگا جہاں انسانی تجربات کو محض جذباتی یا المیہ انداز میں بیان کرنے کے بجائے ان کے پس پردہ عوامل کو بھی دریافت کرنے کی کوشش کی گئی۔ نفسیاتی حقیقت نگاری کے زیر اثر ایسے کردار اور کہانیاں تخلیق ہوئیں جو سماجی جبر اور فرد کے استحصال کی مختلف شکلوں کو آشکار کرتی ہیں۔

یہ افسانے بچوں کے جنسی استحصال کے پس منظر میں اس مسئلے کے نفسیاتی اور سماجی پہلوؤں کو اجاگر کرتے ہیں۔ مثلاً، استحصالی کردار اکثر وہی ہوتے ہیں جو کسی نہ کسی طور پر طاقت کے مراکز سے جڑے ہوتے ہیں—چاہے وہ خاندانی اقتدار ہو، مذہبی تشخص ہو، تعلیمی ادارے ہوں یا سماجی اثر و رسوخ۔ دوسری جانب، متاثرہ بچے اکثر اپنی عمر اور معصومیت کے باعث خاموشی اختیار کرنے پر مجبور ہوتے ہیں جبکہ معاشرہ یا تو انھیں سننے سے انکار کرتا ہے یا ان کے زخموں پر مزید مٹی ڈالنے کی کوشش کرتا ہے۔ عزیز احمد لکھتے ہیں:

"معاشرے کی اصل پہچان اس کے مہذب دعووں میں نہیں، بلکہ اندر اڑوں میں ہوتی ہے جہاں ظلم اور ناانصافی اپنی جڑیں مضبوط کر چکی ہوتی ہیں۔ بچے جو معصومیت کا استعارہ ہوتے ہیں جب درندگی کا شکار بنتے ہیں، تو یہ صرف فرد کا جرم نہیں بلکہ پورے سماج کی ناکامی ہوتی ہے"۔(۱)

یہ موضوع صرف اُردو ادب تک محدود نہیں بلکہ عالمی ادب میں بھی اس پر کثرت سے لکھا گیا ہے، جہاں بچوں کے جنسی استحصال کو کسی ایک مخصوص معاشرے یا وقت کے مسئلے کے طور پر نہیں بلکہ ایک عمومی انسانی مسئلے کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔ اُردو افسانہ بھی اس عالمی رجحان کا حصّہ بنتے ہوئے ایسے کردار اور کہانیاں پیش کر رہا ہے جو ہمارے سماجی تضادات، اخلاقی دوہرے معیارات اور قانونی کمزوریوں کو بے نقاب کرتی ہیں۔ یہ تمام نکات جدید اُردو افسانے میں جنسی استحصال کے موضوع کو ایک منطقی، ادبی اور سماجی بحث کا حصّہ بناتے ہیں۔ کیا آپ چاہتے ہیں کہ میں اس میں کسی مخصوص افسانہ نگار یا افسانے کا ذکر کروں؟

ا۔ معاصر اُردو افسانے میں بچوں کے جنسی استحصال کے محرکات:

جدید اُردو افسانہ زندگی کے ان پہلوؤں کو بے نقاب کرتا ہے جنھیں سماج اکثر نظر انداز کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ بچوں کے جنسی استحصال کا موضوع بھی انہی تلخ حقائق میں شامل ہے جس پر کئی جدید افسانہ نگاروں نے نہایت باریک بینی اور جرأت مندی سے قلم اٹھایا ہے۔ طاہرہ اقبال، نیلوفر اقبال اور نیر عباس علوی جیسے افسانہ نگاروں نے اس موضوع کو محض ایک المیہ کے طور پر پیش کرنے کے بجائے اس کے پس پردہ محرکات اور سماجی رویوں کو اُجاگر کرنے کی کوشش کی ہے۔ ان کے افسانوں میں یہ استحصال کسی ایک فرد کا جرم نہیں بلکہ پورے معاشرتی ڈھانچے کی ایک گہری کمزوری کے طور پر سامنے آتا ہے، جہاں طاقت، خوف اور خاموشی اس جرم کو مسلسل پنپنے کا موقع دیتے ہیں۔ ظفر احمد لکھتے ہیں:

"جدید اُردو افسانہ نفسیاتی گہرائی میں اتر کر انسانی ذہن کے ان گوشوں کو اُجاگر کرتا ہے جہاں خوف، احساسِ جرم اور دبی ہوئی خواہشات سانس لیتی ہیں۔ بچوں کے جنسی استحصال جیسے نازک موضوعات کو افسانہ نگار لاشعوری محرکات اور سماجی جبر کے پس منظر میں دیکھتے ہیں جہاں مجرم بھی اکثر کسی گہری نفسیاتی الجھن کا شکار ہوتا

ہے۔ یہ کہانیاں صرف ظلم کی نشاندہی نہیں کرتیں بلکہ اس ذہنی پیچیدگی کو بھی
سمجھنے کی کوشش کرتی ہیں جو ایک بگڑے ہوئے سماج میں پنپتی ہے"۔(۲)

جدید اُردو افسانے میں اس موضوع کو مختلف اسالیب میں برتا گیا ہے، تاکہ اس کی پیچیدگی اور شدت کو زیادہ موثر انداز میں بیان کیا جا سکے۔ حقیقت نگاری کے تحت کہانیوں میں وہ واقعات اور حالات پیش کیے جاتے ہیں جو عام زندگی میں رونما ہوتے ہیں اور جنہیں زیادہ تر افراد نظر انداز کر دیتے ہیں۔ دیہی اور شہری معاشرت میں یہ مسئلہ مختلف صورتوں میں موجود ہے اور طاہرہ اقبال کے افسانے اسی حقیقت پسندانہ انداز میں ان معاشرتی بندھنوں کو توڑنے کی کوشش کرتے ہیں جو اکثر ظالم کو تحفظ دیتے ہیں اور مظلوم کو خاموشی اختیار کرنے پر مجبور کر دیتے ہیں۔ ان کے افسانوں میں سادہ اور براہ راست بیانیہ ایک ایسے نظام کو سامنے لاتا ہے جو خود اپنے معصوم افراد کے خلاف کھڑا ہو جاتا ہے۔ شعیب خالق لکھتے ہیں:

پانچ سالوں میں میری ماں نے مجھے اس دھوکے میں رکھا کہ اپ سب ٹھیک ہے کہ اب
اپ سب اس کا خیال رکھنے لگے ہیں۔ پھر باپ کو گھورتے ہوئے بولا یہ یقین دلاتی رہیں
کہ مجید صاحب اب بدل گئے ہیں اور میں اس انتظار میں تھا کہ کسی قابل ہو جاؤں تو اپنی
ماں کو اپ لوگوں کے چنگل سے نکال لوں گا۔ اب بیٹا ہچکیوں سے رونے لگا"۔(۳)

بعض کہانیوں میں یہ موضوع تجریدی انداز میں بیان ہوا ہے، جہاں بیانیہ روایتی تسلسل میں نہیں ہوتا بلکہ منتشر خیالات، یادداشتوں اور جذبات کے ذریعے کہانی کو محسوس کروایا جاتا ہے۔ نیر عباس علوی کے افسانے اس اسلوب میں نمایاں نظر آتے ہیں جہاں متاثرہ کردار کی نفسیاتی کیفیت، خواب و خیال اور یادوں کے بکھرے ہوئے ٹکڑے ایک ایسی کہانی بناتے ہیں جو الفاظ سے زیادہ محسوس کی جا سکتی ہے۔ یہ افسانے اس تکلیف اور خوف کو اُجاگر کرتے ہیں جو ایک متاثرہ فرد کے ذہن میں ہمیشہ کے لیے ثبت ہو جاتا ہے۔

جدید افسانے میں سماجی آرکیٹائپ کا استعمال بھی نظر آتا ہے جہاں کردار محض ذاتی کہانی کے بجائے ایک وسیع تر سماجی سچائی کی نمائندگی کرتے ہیں۔ استاد، مولوی، رشتہ دار یا قریبی دوست جیسے کرداروں کو اس طرح پیش کیا جاتا ہے کہ وہ پورے سماجی نظام کی عکاسی کرتے ہیں جو اکثر ان مظالم کو چھپانے میں ملوث ہوتا ہے۔ یہ کردار محض ایک فرد کی کہانی نہیں سناتے بلکہ وہ پورے معاشرتی رویے، طاقت کے توازن اور سماجی منافقت کو بے نقاب کرتے ہیں۔

بچوں کا جنسی استحصال ایک سنگین سماجی مسئلہ ہے جس کے اثرات متاثرہ بچوں کی نفسیات پر گہرے اور دیرپا ہوتے ہیں۔ نفسیات میں اس مسئلے کو مختلف تھیوریز کے ذریعے سمجھنے کی کوشش کی گئی ہے جو اس بات کا تجزیہ کرتی ہیں کہ ایسے تجربات بچوں کی ذہنی اور جذباتی نشوونما پر کس طرح اثر انداز ہوتے ہیں۔ ان تھیوریز کے مطابق، بچوں پر ہونے والا یہ ظلم محض ایک وقتی صدمہ نہیں بلکہ ان کی پوری شخصیت پر اثر ڈال سکتا ہے۔ ان کے اعتماد، رویوں، تعلقات اور مستقبل کے فیصلوں پر گہرے نقوش چھوڑ سکتا ہے۔

اس ضمن میں شعیب خالق کے "درجِ ذیل" افسانے سے اقتباس پیش کیا جارہا ہے:

> "اگر کوئی کچی عمر کا لڑکا اگلی سیٹ پر آ بیٹھتا تو سمندرے کے جسم میں ایک لذتی احساس جاگ اٹھتا اور وہ تانگے کے فرش پر لگی گھنٹی پاؤں سے دباتا تو جیسے اس کی مترنم خوشی پورے احاطے میں سنائی دیتی۔ ایسے میں اکثر کوئی تانگا بان دور سے سمندرے کی اندرونی کیفیت جانتے ہوئے زور سے آواز دیتا۔
>
> "سمندرے بچے مندرجہ زیل ای"؟ یہ سن کر جیسے اس کی گردن فخر سے اکڑ جاتی اور وہ ساتھ بیٹھی کم سن سواری کو مسکراتی آنکھوں سے ٹٹولتا احاطے سے باہر نکل جاتا"۔(۴)

نفسیات میں ٹریاما تھیوری (Trauma Theory) اس حقیقت کو واضح کرتی ہے کہ جنسی استحصال کا تجربہ بچوں کے ذہن پر ایک ناقابلِ فراموش صدمے کے طور پر ثبت ہو جاتا ہے، جو اکثر خوف، عدم تحفظ اور بے بسی کے جذبات پیدا کرتا ہے۔ ایسے بچے اکثر یا تو خود کو دنیا سے کاٹ لیتے ہیں یا ان کے رویے میں شدید جارحیت آ جاتی ہے۔ باؤل بی کی اٹیچمنٹ تھیوری (Bowlby's Attachment Theory) کے مطابق، اگر ابتدائی زندگی میں کسی قریبی فرد سے تحفظ اور اعتماد کی بنیاد ٹوٹ جائے تو بچے میں مستقبل کے تعلقات استوار کرنے کی صلاحیت متاثر ہو سکتی ہے۔ استحصال کا شکار بچے اکثر دوسروں پر اعتماد نہیں کر پاتے اور انھیں زندگی بھر تعلقات میں مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ شہزاد احمد لکھتے ہیں:

> "نفسیاتی عوارض بعض اوقات انسان کو ایسے رویوں کی طرف مائل کر دیتے ہیں جو سماجی اور اخلاقی اقدار سے متصادم ہوتے ہیں۔ جدید نفسیات، خاص طور پر فرائڈ اور ینگ کے نظریات یہ بتاتے ہیں کہ بچپن کے دبے ہوئے تجربات اور لاشعوری کشمکش بعض افراد میں غیر معمولی اور مجرمانہ رجحانات کو جنم دے سکتی ہے۔ بچوں کے جنسی استحصال میں

ملوث افراد اکثر کسی گہری ذہنی پیچیدگی یا شخصیت کی بگاڑ کا شکار ہوتے ہیں، جسے محض سزا سے نہیں، بلکہ گہرے نفسیاتی مطالعے اور علاج سے سمجھنا ضروری ہے"۔(۵)

اسی طرح سوشیو لرننگ تھیوری (Social Learning Theory) یہ بتاتی ہے کہ بچے اپنے ارد گرد کے ماحول سے سیکھتے ہیں۔ اگر وہ ایسے تجربات کا شکار ہوں جہاں استحصال کو دبایا جاتا ہو یا مظلوم کو خاموش رہنے پر مجبور کیا جاتا ہو تو وہ یہ رویہ سیکھ سکتے ہیں کہ ظلم برداشت کرنا ہی ان کا مقدر ہے۔ یہ تھیوری یہ بھی ظاہر کرتی ہے کہ اگر معاشرہ ایسے مسائل پر خاموش رہے تو آئندہ نسلیں بھی اس ظلم کے خلاف کھڑے ہونے کے بجائے اسے خاموشی سے قبول کرتی رہیں گی۔

ان نفسیاتی اثرات کا دائرہ صرف فرد تک محدود نہیں بلکہ یہ پورے سماج کی ساخت کو متاثر کرتے ہیں۔ ایک ایسا معاشرہ جہاں بچوں کا تحفظ یقینی نہ بنایا جا سکے، دراصل اپنی بنیادوں میں دراڑ ڈال رہا ہوتا ہے۔ بچے کسی بھی سماج کا مستقبل ہوتے ہیں اور اگر ان کی ابتدائی زندگی میں خوف، استحصال اور ناانصافی کے تجربات شامل ہوں تو وہ ایک صحت مند اور پُراعتماد نسل کی بجائے خوف زدہ اور عدم تحفظ کا شکار نسل میں تبدیل ہو سکتے ہیں۔

مریم مجید ڈار اپنے افسانے "ادھوری عورت کی کتھا" ایسے ہی ایک منظر کے حوالے سے لکھتی ہیں:

> "میں کبھی بھی سوچتی ہوں۔۔ کہ انسان کس قدر ڈھونگ رچاتا ہے۔۔۔ ساری عمر اپنے بنے ہوئے گورکھ دھندوں میں گھر کر وہ ان محبتوں، رشتوں اور وابستگیوں کو ایسے فراموش کر دیتا ہے جیسے آنول کٹتے ہی بچے کے تن کی ڈور ماں سے جدا ہو جاتی ہے اور جن کے متعلق اس کا خیال ہوتا ہے کہ وہ ان سے جدا ہوتے ہی مر جائے گا۔ ہونہہ!! ڈھونگی!!۔۔۔ اف!! بچہ!! آہ۔۔۔ میں بھی تو کس قدر ڈھونگ رچا لی ہوں ناں؟؟ خوش ہونے کے ۔۔۔۔ ایک کامیاب، مایہ ناز بیرسٹر کی رول ماڈل بیوی ہونے کے۔۔ تمھارے دوستوں، کاروباری شراکت داروں کے لیے پارٹیز ارینج کرتے ہوئے بھی مجھ پر وہ عورت غالب نہیں آتی جسے تم لاہور سے اپنے ساتھ لائے تھے۔۔۔۔"۔(۶)

معاشرتی طور پر یہ مسئلہ اس لیے زیادہ گہرا ہے کہ اکثر استحصال کو چھپایا جاتا ہے، متاثرہ بچے پر الزام دھرا جاتا ہے یا خاندان اور برادری کی عزت کے نام پر اس پر بات کرنے سے گریز کیا جاتا ہے۔ اس رویے کی جڑیں روایتی سماجی ڈھانچے میں پیوست ہیں جہاں اکثر طاقتور افراد کو سماج تحفظ فراہم کرتا ہے اور کمزور طبقہ خاموشی اختیار کرنے پر مجبور ہوتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ کسی بھی سماج کی اصلیت ان ہی موضوعات میں چھپی ہوتی ہے۔ وہ معاشرے جو ان مسائل پر بات کرنے اور انھیں حل کرنے کے بجائے چھپانے میں مصروف رہتے ہیں۔ دراصل اپنی بوسیدہ اخلاقی بنیادوں کو مزید کھوکھلا کر رہے ہوتے ہیں۔

یہ بھی ایک تلخ حقیقت ہے کہ ہمارے معاشرتی نظام میں استحصال کے خلاف کھڑے ہونے کے لیے مؤثر اقدامات موجود نہیں۔ قانون سازی اور پالیسی کی سطح پر اگرچہ کوششیں کی جاتی ہیں مگر سماجی روّیوں میں موجود بے حسی، خوف اور خاموشی ان اقدامات کو غیر مؤثر بنا دیتی ہے۔ اگر بچوں کے تحفظ کو یقینی بنانا ہے تو سماج کو اس بنیادی حقیقت کو تسلیم کرنا ہو گا کہ ظلم اور ناانصافی کو چھپانے سے وہ ختم نہیں ہوتے بلکہ مزید گہرے ہوتے ہیں۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ معاشرہ ایسے موضوعات پر بات کرے۔ متاثرہ بچوں کی بحالی کے لیے کام کرے اور اس رویے کو تبدیل کرے جو خاموشی کو تحفظ اور سچائی کو خطرہ سمجھتا ہے۔ سعید اختر لکھتے ہیں:

> "نفسیاتی پیچیدگیاں بعض افراد کو اس حد تک گرا دیتی ہیں کہ وہ معصومیت پر حملہ کرنے میں بھی عار محسوس نہیں کرتے۔ جدید نفسیات کے مطابق اینٹی سوشل پرسنیلٹی ڈس آرڈر اور پیڈوفیلیا جیسے عوارض ایسے جرائم کی جڑ میں موجود ہو سکتے ہیں۔ یہ مسائل صرف قانونی نہیں بلکہ ذہنی اور جذباتی زوال کی علامت ہیں جہاں مجرم خود بھی کسی نہ کسی نفسیاتی الجھن، ماضی کے صدمات یا شخصیت کی ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہوتا ہے۔ ایسے معاملات کو سمجھنے کے لیے محض سزا نہیں بلکہ گہرے سائنسی اور نفسیاتی تجزیے کی ضرورت ہوتی ہے"۔(۷)

جدید اُردو افسانے میں شعیب خالد نے بچوں کے جنسی استحصال جیسے حساس موضوع کو حقیقت نگاری کے ساتھ پیش کیا ہے۔ ان کے افسانے محض کہانیاں نہیں بلکہ ایک سماجی آئینہ ہیں جن میں وہ ان عوامل کو نمایاں کرتے ہیں جو بچوں کے خلاف ہونے والے ان مظالم کو جنم دیتے ہیں۔ وہ دکھاتے ہیں کہ یہ استحصال

ایک فرد کا جرم نہیں بلکہ ایک ایسے سماجی اور معاشی نظام کی پیداوار ہے جو کمزور طبقات کو تحفظ فراہم کرنے میں ناکام رہتا ہے۔

شعیب خالد کے افسانوں میں اکثر ایسے کردار ملتے ہیں جو معاشی مجبوریوں، طبقاتی تفریق اور سماجی بے حسی کا شکار ہوتے ہیں۔ ان کے ہاں جنسی استحصال صرف ذاتی درندگی نہیں بلکہ طاقتور طبقات کی کمزوروں پر مسلط کردہ ایک مسلسل جبر ہے۔ ان کے افسانوں میں غربت ایک مرکزی کردار کی طرح موجود رہتی ہے—ایسی غربت جو بچوں کو اس خطرے کے حوالے کر دیتی ہے جہاں ان کا کوئی محافظ نہیں ہوتا۔ گھروں میں کام کرنے والے کم عمر بچے، فیکٹریوں میں مزدور یا وہ جو سڑکوں پر بھیک مانگتے ہیں—یہ سبھی استحصال کا شکار ہو سکتے ہیں اور ان کے پاس شکایت کا بھی کوئی راستہ نہیں ہوتا۔

سماج میں پائی جانے والی ناانصافی اور طبقاتی فرق ان کہانیوں میں ایک گہرے پس منظر کے طور پر موجود ہے۔ طاقتور افراد کا یہ یقین کہ وہ کمزوروں کے ساتھ جو چاہیں کر سکتے ہیں۔ دراصل ایک ایسے معاشرتی نظام کی علامت ہے جو اخلاقیات اور انصاف کے بنیادی اصولوں سے محروم ہو چکا ہے۔ ایسے واقعات صرف معاشی طور پر پسے ہوئے طبقے تک محدود نہیں بلکہ مراعات یافتہ طبقات میں بھی رونما ہوتے ہیں جہاں طاقت اور سماجی حیثیت کو بچانے کے لیے معاملات کو دبایا جاتا ہے۔

نفسیاتی طور پر، شعیب خالق کے افسانوں میں ایسے کردار نمایاں ہیں جو مختلف ذہنی بیماریوں کا شکار ہوتے ہیں اور ان کی وجہ سے وہ بچوں کو نشانہ بناتے ہیں۔ اینٹی سوشل پرسنالٹی ڈس آرڈر (ASPD) ایسے افراد میں پایا جاتا ہے جو سماجی اصولوں کو توڑنے میں کسی ہچکچاہٹ کا مظاہرہ نہیں کرتے۔ ان کے لیے جذبات، ہمدردی یا پشیمانی کوئی معنی نہیں رکھتیاور وہ صرف اپنے تسکین کے لیے دوسروں کو نقصان پہنچاتے ہیں۔ بعض اوقات، پیڈوفیلیا (Pedophilia) جیسی ذہنی بیماری کے شکار افراد بچوں کو نشانہ بناتے ہیں اور چونکہ ہمارا سماج ان مسائل کو کھل کر زیر بحث نہیں لاتا، اس لیے ایسے افراد کو شناخت کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔

نفسیاتی طور پر متاثرہ مجرموں کے علاوہ، شعیب خالد نے ان افراد پر بھی روشنی ڈالی ہے جو خود بچپن میں استحصال کا شکار رہے ہوتے ہیں۔ سائیکوڈینامک تھیوری کے مطابق بعض اوقات متاثرہ افراد اپنے ہی صدمے کو دہرانے لگتے ہیں اور وہی ظلم دوسروں پر کرتے ہیں جو ان کے ساتھ ہوا تھا۔ ایسے کرداروں میں

داخلی انتشار، احساسِ جرم اور غصہ پایا جاتا ہے، مگر وہ اس پر قابو نہیں پا سکتے اور یوں ایک شیطانی چکر چلتا رہتا ہے۔

یہ افسانے ہمیں باور کراتے ہیں کہ بچوں کے جنسی استحصال جیسے جرائم کو فرد کے انحراف تک محدود سمجھنا درست نہیں بلکہ یہ سماجی و معاشی حالات کا بھی نتیجہ ہیں۔ کمزور قانون، بے حس معاشرہ اور طبقاتی فرق اس ظلم کو تقویت دیتے ہیں۔ ایسے کردار، جو ان کہانیوں میں مجرم کے طور پر سامنے آتے ہیں۔ محض بیمار ذہن کے مالک افراد نہیں بلکہ وہ ایک ایسے سماجی ڈھانچے کے پروردہ ہوتے ہیں جو ان کے جرائم پر پردہ ڈالتا ہے اور متاثرین کو خاموش رہنے پر مجبور کرتا ہے۔ ڈاکٹر سلیم اختر لکھتے ہیں:

> "جدید اُردو افسانہ صرف کہانی بیان کرنے کا فن نہیں، بلکہ انسانی ذہن کے پیچیدہ رویوں کا آئینہ بھی ہے۔ ایسے نازک موضوعات کو نفسیاتی حوالوں سے پرکھنا نہ صرف ادب کو گہرائی عطا کرتا ہے بلکہ سماجی شعور میں اضافے کا باعث بھی بنتا ہے"۔(۸)

شعیب خالق کے افسانے ہمیں ان کہانیوں سے زیادہ کچھ اور دیتے ہیں—یہ وہ کڑوا سچ ہے جس سے ہم نظریں چرا نہیں سکتے۔ ان میں ایک اجتماعی جرم کا شعور موجود ہے اور یہ قاری کو صرف کہانی سنانے کے بجائے اسے معاشرتی ناانصافی کے خلاف سوچنے پر مجبور کرتے ہیں۔ یہ افسانے ہمیں بتاتے ہیں کہ اگر ہم واقعی بچوں کو محفوظ بنانا چاہتے ہیں تو ہمیں صرف انفرادی مجرموں کو سزا دینے کے بجائے پورے سماجی نظام کو بدلنا ہو گا جو اس جرم کی راہ ہموار کرتا ہے۔

جنسی استحصال کے سلسلے میں افسانہ "ایک روپیہ روزانہ" سے اقتباس زیرِ نظر ہے:

> "مگر پھر ایک رات بند دکان کے اندر لالٹین تو نہ تھی مگر بلب بجھا اور استاد نے شفیق کو پہلی بار پنکچر لگانے کا درس دیا اور پھر ہر رات پنکچر کا خوف اسے ایک دن دکان سے بھگا لے گیا اور جلد ہی گندگی کے ڈھیروں نے اسے اپنی پناہ میں لے لیا"۔(۹)

جدید اُردو افسانے میں بچوں کے جنسی استحصال کو محض ایک سماجی مسئلہ سمجھنے کے بجائے اسے نفسیاتی اور وجودیاتی المیے کے طور پر بھی دیکھا گیا ہے۔ حمزہ حسن عباسی نے اس موضوع کو ایک گہرے نفسیاتی تناظر میں بیان کیا ہے۔ جہاں استحصال کے اثرات متاثرہ بچوں کی شخصیت اور ان کے مستقبل پر گہرے نقوش چھوڑتے ہیں۔ وہ اس المیے کو فرد کے ذہنی اور جذباتی وجود سے جوڑتے ہیں جہاں بچپن میں ہونے والے

حادثات ایک انسان کی پوری نفسیاتی ساخت کو بدل کر رکھ دیتے ہیں۔ ان کے افسانوں میں کردار محض ظاہری اذیت نہیں جھیلتے بلکہ اندرونی خلفشار اور نفسیاتی بحران سے گزرتے ہیں جو ان کی شناخت، تعلقات اور شخصیت کو مکمل طور پر متاثر کرتا ہے۔

نفسیاتی تحقیق کے مطابق، بچپن کے صدمات بالخصوص جنسی استحصال کا شکار ہونے والے افراد اکثر پوسٹ ٹرامیٹک اسٹریس ڈس آرڈر (PTSD) کا سامنا کرتے ہیں جس کی جھلک حمزہ حسن عباسی کے افسانوں میں نمایاں نظر آتی ہے۔ ان کے کرداروں میں ایک شدید احساسِ جرم، خوف، عدم تحفظ اور خود اعتمادی کی کمی پائی جاتی ہے۔ کچھ افراد اس صدمے کو اپنے اندر دفن کر لیتے ہیں اور پوری زندگی اس کا بوجھ اٹھاتے ہیں جبکہ بعض اس تکلیف دہ تجربے کو دہرانے لگتے ہیں جسے سائیکوڈینامک تھیوری میں ریپٹیشن کمپلشن (Repetition Compulsion) کہا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان افسانوں میں بعض کردار جو خود بچپن میں مظلوم تھے، بڑے ہو کر دوسرے معصوموں پر ظلم ڈھانے لگتے ہیں۔

مریم مجید ڈار نے اس موضوع کو معاشرتی تناظر میں دیکھا ہے اور ان سماجی حالات کا جائزہ لیا ہے جو ایسے جرائم کی راہ ہموار کرتے ہیں۔ ان کے افسانے بتاتے ہیں کہ بچوں کا استحصال صرف انفرادی درندگی کا نتیجہ نہیں بلکہ ایک سماجی ڈھانچے کی پیداوار ہے جو کمزوروں کو تحفظ دینے میں ناکام ہے۔ غربت، گھریلو جھگڑے، والدین کی عدم موجودگی اور قانونی سقم ایسے عناصر ہیں جو مجرموں کے لیے راستے کھولتے ہیں۔ وہ ان کہانیوں میں اس بے بسی کو نمایاں کرتی ہیں جو متاثرہ بچے محسوس کرتے ہیں جہاں ان کے پاس نہ شکایت کا راستہ ہوتا ہے، نہ انصاف کی اُمید۔

اس سلسلے میں اقتباس ملاحظہ ہو:

> "رفتہ رفتہ وہ ہر طرح کے ماس کا عادی ہو گیا مگر چھوٹے کی لذت سے وہ پہلی بار تب آشنا ہوا جب بھائی کی چھ سال کی بٹو کو ٹیکہ لگوانے لے گیا تھا۔
>
> ننھی بٹو ٹیکے کے خوف سے کانپ رہی تھی اور اس کی گود میں سمٹ کر اس نے زور سے اس کا بازو دبوچ لیا تھا۔ بٹو کا لرزتا ہاتھ اسے سرور کی ایک نئی دنیا میں لے گیا۔ اس نے کمپوڈر سے دوا کی پرچی تھامی اور پلاسٹک کی بوتل والی لال دوا خریدتے ہوئے اس نے ایک چکنا محلول بھی خرید لیا۔

واپسی پر بٹو کا تاپ اتنا بڑھ گیا تھا کہ وہ بے ہوش ہو گئی تھی۔ غریب کی ایسی حالت کچھ دو دن ہی رہی۔ پھر ماس ٹھنڈا پڑ گیا اور مٹی کی بھوک مٹانے قبرستان میں جا پہنچا۔ مٹی کو ٹھنڈے گرم سے فرق نہیں پڑتا"۔(۱۰)

رؤف احمد لکھتے ہیں:

"مریم مجید ڈار نے جدید اُردو افسانے میں ایسے موضوعات کو اپنایا ہے جو سماج کے پوشیدہ زخموں کو نمایاں کرتے ہیں۔ ان کے افسانے نہ صرف حقیقت پسندی کا مظہر ہیں بلکہ گہرے نفسیاتی اور جذباتی احساسات سے بھی لبریز ہوتے ہیں۔ وہ انسانی رشتوں، نفسیاتی کشمکش اور معاشرتی ناہمواریوں کو اس انداز میں بیان کرتی ہیں کہ قاری نہ صرف کہانی کا حصہ بن جاتا ہے بلکہ اس کی گہرائیوں میں بھی اترتا چلا جاتا ہے"۔(۱۱)

مریم مجید ڈار کے افسانوں میں ایسے مجرموں کی نفسیات کو بھی تفصیل سے بیان کیا گیا ہے جو بچوں کا استحصال کرتے ہیں۔ وہ اینٹی سوشیل پرسنالٹی ڈس آرڈر (ASPD) میں مبتلا ہوتے ہیں جو انہیں اخلاقی احساس سے عاری کر دیتا ہے۔ کچھ مجرم ایسے ہوتے ہیں جو مکمل طور پر سماج کا حصہ نظر آتے ہیں—بظاہر شریف، عزت دار اور قابل اعتماد—لیکن اندرونی طور پر ایک خطرناک ذہنی بیماری کے شکار ہوتے ہیں۔ مریم مجید ڈار ان کرداروں کے ذریعے اس خوفناک حقیقت کو بے نقاب کرتی ہیں کہ یہ جرائم ہمیشہ اجنبیوں کے ہاتھوں نہیں ہوتے بلکہ اکثر گھر کے اندر، خاندان کے قریبی افراد یا بااثر لوگوں کے ذریعے ہوتے ہیں۔

یہ دونوں لکھاری اس حقیقت کو اجاگر کرتے ہیں کہ بچوں کے جنسی استحصال کا المیہ صرف جسمانی یا قانونی مسئلہ نہیں بلکہ ایک اجتماعی شعور کا امتحان ہے۔ جہاں حمزہ حسن عباسی اس کا نفسیاتی پہلو بیان کرتے ہیں، وہاں مریم مجید ڈار اس کے سماجی و معاشرتی اسباب پر روشنی ڈالتی ہیں۔ دونوں کا بیانیہ ہمیں یاد دلاتا ہے کہ اگر ہم واقعی اس مسئلے کا حل چاہتے ہیں تو ہمیں اسے فرد واحد کے جرم کے طور پر نہیں بلکہ ایک گہری سماجی اور نفسیاتی بیماری کے طور پر دیکھنا ہو گا۔

جدید اُردو افسانے میں بچوں کے جنسی استحصال کو ایک پیچیدہ اور گہری سماجی حقیقت کے طور پر پیش کیا گیا ہے، جس کے پیچھے کئی عوامل کارفرما ہوتے ہیں۔ ان افسانوں میں یہ عوامل محض کہانی کے جزو کے طور پر نہیں آتے بلکہ ایک مکمل سماجی تجزیے کے طور پر ابھرتے ہیں جہاں ان کی جڑیں انسانی نفسیات، طبقاتی تفریق اور سماجی بے حسی میں پیوست دکھائی دیتی ہیں۔

معاشی عدم استحکام اور طبقاتی فرق اس موضوع پر لکھے گئے افسانوں میں اکثر ایسے کردار سامنے آتے ہیں جو غربت کے مارے ہوتے ہیں اور جن کے پاس بنیادی سہولتوں کی کمی ہوتی ہے۔ ایسے کرداروں میں زیادہ تر وہ بچے شامل ہوتے ہیں جو مزدوری پر مجبور کیے جاتے ہیں، گھروں میں کام کرتے ہیں یا گلیوں میں وقت گزارتے ہیں۔ غربت کی شدت انہیں ایک ایسے مقام پر لے آتی ہے جہاں وہ خود کو غیر محفوظ پاتے ہیں اور ان کا استحصال آسان ہو جاتا ہے۔ والدین کی بے بسی، مجرموں کے لیے مواقع پیدا کرتی ہے جو مالی بدحالی کا فائدہ اٹھا کر بچوں کو شکار بناتے ہیں۔ سہیل احمد لکھتے ہیں:

> "معاشرتی طبقاتی فرق نہ صرف وسائل کی تقسیم کو متاثر کرتا ہے بلکہ سماجیجرائم کے فروغ میں بھی اہم کردار ادا کرتا ہے۔ معاشی اور سماجی محرومی کے شکار بچے اکثر ان حالات میں پھنس جاتے ہیں جہاں ان کا استحصال کیا جاتا ہے۔ بچوں کے جنسی استحصال جیسے گھناؤنے جرائم کی جڑیں صرف فرد کی ذہنی خرابی میں نہیں، بلکہ اس طبقاتی نظام میں بھی پیوست ہیں جو کمزور کو ہمیشہ کمزور رکھنے پر قائم ہے۔ جب تک طبقاتی شعور بیدار نہیں ہو گا، یہ مظلومیت ایک مستقل حقیقت بنی رہے گی"۔(۱۲)

گھریلو ناچاقی اور بے توجہی افسانوں میں ایسے ماحول کی عکاسی بھی کی گئی ہے جہاں گھر کے اندر تنازعات اور عدم توجہی بچوں کو مزید غیر محفوظ بنا دیتی ہے۔ گھریلو تشدد، والدین میں علیحدگی یا شدید بے حسی بچوں کو جذباتی طور پر کمزور کر دیتی ہے۔ ایسے بچے اپنی حفاظت کے لیے کسی بالغ کی مدد لینے سے بھی قاصر رہتے ہیں اور اکثر ان افراد پر بھروسہ کر لیتے ہیں جو بعد میں ان کا استحصال کرتے ہیں۔ جدید افسانے اس تلخ حقیقت کو نمایاں کرتے ہیں کہ ایسے واقعات صرف اجنبیوں کے ہاتھوں نہیں بلکہ قریبی رشتہ داروں، دوستوں اور بااعتماد افراد کے ذریعے بھی وقوع پذیر ہوتے ہیں۔

"رحیمو کی ریڑھی" میں حمزہ حسن شیخ لکھتے ہیں کہ ہم اپنے بچوں کی روزی روٹی اور ان کے بہتر مستقبل کے لیے بعض اوقات دن رات محنت کر کے کچھ پیسے جمع کرتے ہیں تاکہ آنے والے مشکل دنوں میں ان کے کام آئیں مگر کئی بار ان کا مصرف کچھ اور ہی ہوتا ہے۔ افسانے میں غربت زدہ خاندان کے ایک واقعہ کے حوالے سے بیان کرتے ہیں کہ:

"پرانی دیواریں سیم زدہ ہو کر گر رہی تھیں جبکہ پرانی چھتیں ہر بارش کے بعد ٹپکتی تھیں۔ زندگی اس کے لیے آسان نہ تھی۔ زندگی میں پہلی بار بھوک اور پیاس سے چھٹکارے کے بعد اس کو اپنے خاندان اور گھر کی بہتری کے لیے سوچنے کا موقع ملا تھا۔ یہ اس بات کی نشانی تھی کہ اب قسمت کی دیوی اس پر مہربان ہو گئی ہے اور اس کی زندگی میں بھی تبدیلی آنے والی ہے۔ مرمت کے خیال نے اس کو کچھ لمحوں کے لیے خوش کر دیا اور اُس کے چہرے پر خوشی کی لہر دوڑ گئی"۔(۱۳)

اس کی یہ خوشی اُس وقت ادھوری رہ جاتی ہے جب اس کے ساتھ جانے والے ننھے بچے پر ایک خاتون کا پالتو کتا حملہ کر دیتا ہے اور وہ اس کتے کو موت کے گھاٹ اتار دیتا ہے۔ اس کو کتے کے قتل کے مقدمہ میں گرفتار کر لیا جاتا ہے اور وہ تھوڑی بہت رقم جو اس نے اپنے خوابوں کی تعبیر کے لیے جمع کی تھی۔ اس مقدمہ پر خرچ ہو جاتے ہے۔

قانونی اور سماجی بے حسی ان کہانیوں میں دکھایا گیا ہے کہ جب بچے اپنے اوپر ہونے والے ظلم کے خلاف آواز بلند کرتے ہیں تو انہیں خاموش کروا دیا جاتا ہے۔ معاشرہ ان واقعات کو تسلیم کرنے کے بجائے اکثر متاثرہ بچوں اور ان کے خاندانوں کو ہی بدنام کر دیتا ہے۔ قانونی نظام کی پیچیدگیاں، انصاف کے عمل میں تاخیر اور مجرموں کے خلاف سخت کارروائی نہ ہونا ان افسانوں میں ایک مستقل موضوع کے طور پر اُبھرتا ہے۔ اس کے نتیجے میں بچوں کو نہ صرف انصاف سے محروم کر دیا جاتا ہے بلکہ انہیں مزید خطرے میں ڈال دیا جاتا ہے۔

نفسیاتی امراض اور ذہنی انحراف افسانے ایسے کرداروں کی بھی نشان دہی کرتے ہیں جو ذہنی بیماریوں میں مبتلا ہوتے ہیں اور بچوں کا استحصال کرتے ہیں۔ بعض مجرم ایسے ہوتے ہیں جو پیڈوفیلیا جیسی ذہنی بیماری کے شکار ہوتے ہیں، جبکہ کچھ ایسے ہوتے ہیں جو اپنی ہی ماضی کی تکلیف دہ یادوں کو دہرانے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ یہ افسانے ایک نفسیاتی گہرائی کے ساتھ ان کرداروں کے محرکات کو بیان کرتے ہیں، جن کی ذہنی پیچیدگیاں انہیں ایک ظالم اور خطرناک راہ پر ڈال دیتی ہیں۔

ثقافتی جمود اور خاموشی کا رویہ یہ افسانے اس تلخ حقیقت کو بھی آشکار کرتے ہیں کہ معاشرتی ڈھانچے میں بچوں کے جنسی استحصال جیسے موضوعات پر بات کرنا ممنوع سمجھا جاتا ہے۔ خاموشی اور لاعلمی کی یہی فضا

ان مجرموں کو مزید شہ دیتی ہے۔ ایسے معاملات کو چھپانے کا رجحان، والدین کی خاموشی اور بچوں کی تربیت میں اس معاملے پر بات نہ کرنا، سبھی عوامل ان جرائم کو مزید گہرا کر دیتے ہیں۔ افسانوں میں دکھایا گیا ہے کہ کیسے یہ ثقافتی جمود بچوں کو تحفظ دینے کے بجائے انہیں مزید غیر محفوظ بنا دیتا ہے۔

جدید اُردو افسانے میں ان تمام پہلوؤں کو گہرائی کے ساتھ بیان کیا گیا ہے جہاں بچوں کے جنسی استحصال کو صرف ایک جرم نہیں بلکہ ایک مکمل سماجی و نفسیاتی المیے کے طور پر دیکھا گیا ہے۔ یہ کہانیاں ہمیں مجبور کرتی ہیں کہ ہم اس مسئلے کو سطحی طور پر نہ لیں بلکہ اس کے گہرے اسباب کو سمجھیں اور ایک اجتماعی شعور پیدا کریں جو اس استحصال کو جڑ سے ختم کرنے میں مدد دے۔

۲۔ معاصر اُردو افسانے میں بچوں کے جنسی استحصال کی صورتیں:

جدید اُردو افسانہ اپنی حقیقت نگاری اور گہرے نفسیاتی تجزیے کے باعث معاشرتی مسائل کو نمایاں کرنے کا ایک موثر ذریعہ رہا ہے۔ ان مسائل میں بچوں کا جنسی استحصال ایک ایسا موضوع ہے جسے مختلف صورتوں میں افسانوی ادب میں جگہ ملی ہے۔ جدید افسانہ نگاروں نے اس تلخ حقیقت کو محض واقعات کی سطح پر بیان نہیں کیا بلکہ اس کے سماجی، نفسیاتی اور ثقافتی پہلوؤں کو بھی اجاگر کیا ہے تاکہ قاری ان کہانیوں میں صرف جذباتی شاک کا شکار نہ ہو بلکہ وہ اس المیے کی جڑوں کو سمجھنے کے قابل ہو سکے۔

افسانوی ادب میں بچوں کے جنسی استحصال کی کئی صورتیں سامنے آتی ہیں۔ ایک عام نوعیت وہ ہے جس میں کمزور اور بے سہارا بچوں کو استحصال کا نشانہ بنایا جاتا ہے، جن میں زیادہ تر وہ شامل ہوتے ہیں جو غریب طبقے سے تعلق رکھتے ہیں یا ایسے ماحول میں پروان چڑھتے ہیں جہاں ان کا کوئی محافظ موجود نہیں ہوتا۔ دوسری صورت وہ ہے جہاں استحصال کرنے والے خاندان کے قریبی افراد ہوتے ہیں اور متاثرہ بچے خوف، شرم یا دباؤ کے تحت خاموشی اختیار کرنے پر مجبور ہوتے ہیں۔ جدید افسانے اس المناک حقیقت کو بے نقاب کرتے ہیں کہ جنسی استحصال اکثر ان افراد کے ذریعے ہوتا ہے جن پر سب سے زیادہ بھروسہ کیا جاتا ہے۔ تیسری صورت میں یہ استحصال سماجی اور معاشرتی ڈھانچے کے کسی خاص پہلو سے جڑا ہوتا ہے، جیسے مدرسوں، یتیم خانوں یا گھریلو ملازمین کے ماحول میں پائی جانے والی خامیاں جہاں کم عمر بچے مجرموں کے رحم و کرم پر ہوتے ہیں۔

اُردو افسانے میں اس مسئلے کی پیشکش حقیقت نگاری، علامت اور تجرید کے امتزاج سے کی گئی ہے۔ حقیقت نگار افسانہ نگار اس موضوع کو ایک ایسے بیانیے کے تحت بیان کرتے ہیں جس میں کوئی پردہ پوشی نہیں

کی جاتیاور کہانی کی فضاء قاری کو براہ راست ایک تلخ سچائی کے سامنے لا کھڑا کرتی ہے۔ علامتی افسانہ اس استحصال کو محض ایک جرم کے طور پر نہیں بلکہ ایک اجتماعی مسئلے کے طور پر پیش کرتا ہے جہاں ظلم کرنے والا صرف ایک فرد نہیں بلکہ ایک پورا سماجی ڈھانچہ ہوتا ہے۔ تجریدی افسانے میں یہ موضوع اکثر ایسے استعاروں کے ذریعے بیان کیا جاتا ہے جو کہانی کے متن میں پوشیدہ ہوتے ہیں مگر قاری پر گہرا نفسیاتی اثر چھوڑتے ہیں۔ سہیل احمد لکھتے ہیں:

> "ادب محض الفاظ کا مجموعہ نہیں، بلکہ سماجی ڈھانچے کی عکاسی اور اس سے اخذ کردہ حقیقتوں کا اظہار ہے۔ اس کی جڑیں انسانی نفسیات کی پیچیدگیوں میں پیوست ہیں، جہاں فرد کی داخلی کشمکش اور معاشرتی جبر ایک دوسرے میں گھل مل جاتے ہیں۔ یہی گہرا تعلق ادب کو محض کہانی سنانے کے بجائے انسانی ذہن اور سماج کے باہمی تعامل کو سمجھنے کا ذریعہ بناتا ہے"۔(۱۴)

اگر اُردو ادب کے ساتھ عالمی ادب کا جائزہ لیا جائے تو یہ واضح ہوتا ہے کہ بچوں کے جنسی استحصال کا موضوع صرف مقامی نہیں بلکہ بین الاقوامی سطح پر بھی ایک ادبی مکالمے کا حصہ رہا ہے۔ مغربی ادبیات میں گبریل گارشیا مارکیز، نبوکوفاور ٹونی موریسن جیسے ادیبوں نے اس موضوع کو مختلف پیرایوں میں پیش کیا۔ نبوکوف کے ناول Lolita میں ایک بالغ شخص کی نفسیاتی پیچیدگی اور ایک کمسن لڑکی کے ساتھ اس کا استحصالی رویہ ایک بڑے ادبی اور اخلاقی مباحثے کا سبب بنا۔ ٹونی موریسن نے اپنے ناول The Bluest Eye میں ایک معصوم بچی پر ہونے والے جنسی استحصال کو نہایت حساسیت کے ساتھ بیان کیا ہے جو نسل پرستی اور طبقاتی فرق کے ساتھ جڑا ہوا ہے۔ عالمی ادب میں یہ مسئلہ زیادہ تر نفسیاتی اور سماجی نقطہ نظر سے دیکھا جاتا ہے جبکہ اُردو ادب میں اسے سماجی حقیقت نگاری اور المیے کے انداز میں پیش کیا جاتا ہے۔

تخیل پسندی کی تکنیک افسانوی ادب میں اس حساس موضوع کو مزید موثر انداز میں پیش کرنے میں مدد دیتی ہے۔ اس حوالے سے نفسیاتی تھیوریز بھی اہمیت رکھتی ہیں، خاص طور پر سگمنڈ فرائیڈ کی Psychosexual Development Theory جس میں بتایا گیا ہے کہ بچپن کے تجربات انسان کی پوری زندگی پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ جنسی استحصال کا شکار ہونے والے بچے اکثر بالغ ہونے کے بعد گہرے نفسیاتی مسائل سے دوچار ہوتے ہیں جیسے اضطراب، عدم تحفظ، خود اعتمادی کی کمی، یا بعض اوقات وہ خود بھی جارحانہ

رویہ اختیار کر لیتے ہیں۔ ژاک لاکان کی تھیوری Mirror Stage بھی اس معاملے کو سمجھنے میں مدد دیتی ہے جس کے مطابق بچہ اپنے ابتدائی سالوں میں اپنی شناخت بنانا شروع کرتا ہے اور اگر ان سالوں میں کوئی شدید صدمہ پیش آجائے تو وہ اس کی نفسیاتی تشکیل کو مستقل طور پر متاثر کر دیتا ہے۔ اُردو ادب میں ایسے کردار دیکھنے کو ملتے ہیں جو بچپن میں ہونے والے استحصال کی وجہ سے پوری زندگی عدم تحفظ، خوف، یا جذباتی پیچیدگی کا شکار رہتے ہیں۔ ڈاکٹر سلیم اختر لکھتے ہیں:

> "نفسیاتی تنقید میں نہ صرف سماجی ڈھانچے بلکہ کردار کے لاشعوری محرکات کو بھی پرکھا جاتا ہے۔ فرائڈ کے نظریۂ نفسیاتی تجزیہ کے مطابق، کردار کے اعمال اور رویے اس کے دبے ہوئے جذبات اور ماضی کے تجربات سے جڑے ہوتے ہیں۔ یہی داخلی کشمکش اور سماجی عوامل مل کر ادب میں کرداروں کی نفسیاتی ساخت کو تشکیل دیتے ہیں، جس سے کہانی کی تہہ در تہہ معنویت ابھر کر سامنے آتی ہے"۔(۱۵)

تخیل پسندی کی تکنیک کو بعض افسانہ نگاروں نے بطور ہتھیار استعمال کیا ہے تاکہ وہ اس مسئلے کو حقیقت سے ذرا فاصلے پر رکھ کر بیان کر سکیں اور قاری کو زیادہ گہرے طور پر سوچنے پر مجبور کر سکیں۔ ایسے افسانوں میں بچوں کے ذہنی تجربات کو خواب، دھندیا کسی ماورائی دنیا کے استعارے میں بیان کیا جاتا ہے تاکہ قاری حقیقت کی تلخی کو ایک مختلف سطح پر محسوس کر سکے۔

جدید اُردو افسانے میں بچوں کے جنسی استحصال جیسے موضوعات کو نہ صرف حقیقت نگاری بلکہ ڈرامائی اور نفسیاتی انداز میں بھی برتا گیا ہے۔ یہ مسئلہ محض ایک جرم کی شکل میں نہیں بلکہ سماجی، ثقافتی اور نفسیاتی پیچیدگیوں کے ساتھ افسانوی ادب میں سامنے آتا ہے۔ مختلف افسانہ نگاروں نے اس المیے کو اس انداز میں پیش کیا ہے کہ قاری کو محض ہمدردی ہی نہیں بلکہ اس کے گہرے اسباب پر غور کرنے پر بھی مجبور کیا جاتا ہے۔ اس موضوع پر کئی ڈرامے بھی تخلیق کیے جا چکے ہیں جن میں بچوں پر ہونے والے جنسی مظالم کو براہِ راست اور استعاروں کے ذریعے پیش کیا گیا ہے۔

شعیب خالق جیسے افسانہ نگاروں کا اسلوب ڈرامائی عناصر سے بھرپور ہوتا ہے۔ ان کے افسانے محض واقعات کا بیان نہیں بلکہ ایک نفسیاتی تجزیہ بھی پیش کرتے ہیں۔ وہ کہانی کو اس انداز میں ترتیب دیتے ہیں کہ کرداروں کے داخلی احساسات اور ان کے گرد موجود سماجی ماحول کی پیچیدگیاں قاری پر مکمل طور پر واضح ہو

سکیں۔ ان کا بیانیہ اکثر ایک کشمکش کے اصول پر استوار ہوتا ہے جہاں معصومیت اور درندگی کے درمیان ایک واضح تضاد دکھائی دیتا ہے۔ بچوں کے جنسی استحصال کے موضوع پر لکھے گئے افسانوں اور ڈراموں میں کرداروں کی نفسیاتی پرتوں کو کھولنے کی کوشش کی گئی ہے۔ سعید اختر لکھتے ہیں:

> "اس میں نہ صرف متاثرہ بچوں کے اندرونی خوف، شرمندگی اور خاموشی کا تجزیہ کیا گیا ہے بلکہ ان کرداروں کی بھی تشریح کی گئی ہے جو اس جرم میں ملوث ہوتے ہیں۔ نفسیاتی تحقیق اس بات کی نشاندہی کرتی ہے کہ بعض نفسیاتی بیماریوں میں مبتلا افراد اس قسم کے جرائم کی طرف مائل ہوتے ہیں۔ ان میں Antisocial Personality Disorder اور Pedophilic Disorder شامل ہیں جن کے شکار افراد بچوں کو نشانہ بناتے ہیں اور اکثر اپنی حرکات کا جواز پیش کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اُردو افسانہ ان بیماریوں کو صرف ایک نفسیاتی مسئلہ نہیں بلکہ سماجی اور خاندانی بے راہ روی کا نتیجہ بھی قرار دیتا ہے"۔(۱۶)

اس موضوع پر تحریر کیے گئے اُردو ڈراموں میں بھی انہی پہلوؤں کو اجاگر کیا گیا ہے لیکن چونکہ ڈرامے کی ساخت افسانے سے مختلف ہوتی ہے، اس لیے وہاں کہانی زیادہ تر جذباتی سطح پر پیش کی جاتی ہے۔ ڈرامے میں مکالمے کی مدد سے کرداروں کے احساسات اور المیے کو زیادہ واضح کرنے کی کوشش کی جاتی ہے جبکہ افسانہ زیادہ تر علامتی اور بیانیہ تکنیک پر انحصار کرتا ہے۔ بعض ڈراموں میں یہ موضوع پس منظر میں رہتا ہے اور ایک سماجی حقیقت کے طور پر ظاہر ہوتا ہے جبکہ بعض میں اسے مرکزی کہانی کے طور پر پیش کیا جاتا ہے تاکہ ناظرین پر اس کا گہرا اثر ہو۔

مریم مجید ڈار اور حمزہ حسن عباسی جیسے افسانہ نگاروں نے اس مسئلے کو سماجی اور نفسیاتی تناظر میں پرکھا ہے۔ مریم مجید ڈار نے اپنی تحریروں میں ایسے لوگوں کی نفسیات کو اُجاگر کیا ہے جو بچوں کا جنسی استحصال کرتے ہیں اور ساتھ ہی ان سماجی حالات کی طرف بھی اشارہ کیا ہے جو ان واقعات کو جنم دیتے ہیں۔ ان کے افسانوں میں اکثر جرم کرنے والے کردار مکمل طور پر "شیطانی" نہیں ہوتے بلکہ وہ ایک ایسے معاشرتی نظام کی پیداوار دکھائی دیتے ہیں جو بے حسی، خاموشی اور طاقت کے ناجائز استعمال پر مبنی ہے۔

حمزہ حسن عباسی نے اس موضوع کو ایک نفسیاتی المیے کے طور پر پیش کیا ہے جہاں متاثرہ بچے کی ذہنی حالت اور اس کی زندگی پر پڑنے والے اثرات کو نمایاں کیا گیا ہے۔ ان کے افسانوں میں یہ واضح کیا گیا ہے کہ

جنسی استحصال کا شکار ہونے والے بچے بڑے ہو کر مختلف نفسیاتی پیچیدگیوں کا شکار ہو سکتے ہیں، جیسے ڈپریشن، بے اعتمادی، یا بعض اوقات خود وہ بھی جارحانہ رویہ اختیار کر سکتے ہیں۔ ان کی کہانیوں میں جرم کو صرف ایک فرد کے عمل کے طور پر نہیں بلکہ ایک اجتماعی ناکامی کے طور پر دکھایا گیا ہے جہاں خاندان، معاشرہ اور قانونی نظام سب کسی نہ کسی حد تک ذمہ دار ہوتے ہیں۔ نفسیاتی تحقیق اس بات کی نشاندہی کرتی ہے کہ جنسی استحصال کا شکار ہونے والے بچوں پر طویل مدتی اثرات مرتب ہو سکتے ہیں۔ Post-Traumatic Stress Disorder (PTSD)، خود اعتمادی کی کمی اور تعلقات میں مشکلات جیسے مسائل ان کی شخصیت پر گہرا اثر چھوڑ سکتے ہیں۔ بعض بچوں میں یہ صدمہ ان کے تعلیمی اور سماجی رویوں پر اثر انداز ہوتا ہے اور وہ یا تو مکمل خاموشی اختیار کر لیتے ہیں یا خود کو باغیانہ سرگرمیوں میں ملوث کر لیتے ہیں۔

جدید اُردو افسانہ اور ڈرامہ، دونوں ہی اس تلخ حقیقت کو نمایاں کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ بچوں کے جنسی استحصال جیسے مسائل محض جرم نہیں بلکہ ایک سماجی بحران ہیں، جنہیں حل کرنے کے لیے فرد، خاندان اور ریاست تینوں کو ذمہ داری لینا ہوگی۔ افسانہ جہاں قاری کو گہرے تجزیے پر مجبور کرتا ہے وہیں ڈرامہ جذباتی سطح پر اس موضوع کی شدت کو اجاگر کرتا ہے۔ ان دونوں اصناف کے امتزاج سے ایک ایسی فکری اور جذباتی فضا پیدا ہوتی ہے جو اس مسئلے پر اجتماعی مکالمے کو جنم دے سکتی ہے۔ یہ افسانہ چھوٹا گوشت جدید اُردو افسانے میں ایک منفرد مقام رکھتا ہے، جو بچوں کے جنسی استحصال جیسے نازک اور تلخ موضوع کو علامتی انداز میں بیان کرتا ہے۔ یہ محض ایک بیانیہ افسانہ نہیں، بلکہ ایک گہرا سماجی اور اخلاقی سوال ہے جو قاری کو محض ایک داستان سنانے کے بجائے اس کے شعور میں ہلچل پیدا کرتا ہے۔ رؤف احمد ملک لکھتے ہیں:

> "اس افسانے کی خوبی یہ ہے کہ یہ کردار کی داخلی دنیا کو محض سطحی انداز میں پیش نہیں کرتا بلکہ اس کی نفسیاتی پیچیدگیوں کو بھی اجاگر کرتا ہے۔ کردار کی سوچ، اس کے لاشعوری اضطراب اور داخلی کشمکش کو ایسے انداز میں بیان کیا گیا ہے کہ قاری کو نہ صرف اس کی فکری وسعتوں کا ادراک ہوتا ہے بلکہ اس کے رویے کے پس پردہ عوامل کو سمجھنے کا موقع بھی ملتا ہے۔ یہی گہرائی اسے ایک عام کردار کے بجائے ایک جیتی جاگتی نفسیاتی حقیقت بنا دیتی ہے"۔(۱۷)

افسانے کا بنیادی اسلوب علامتی ہے۔ اس میں حقیقت کو براہ راست بیان کرنے کے بجائے ایسے استعارے اور علامتیں استعمال کی گئی ہیں جو نہ صرف قاری کی فکری سطح پر اثر انداز ہوتی ہیں بلکہ ایک گہری معنویت پیدا کرتی ہیں۔ عنوان چھوٹا گوشت بھی ایک علامتی مفہوم رکھتا ہے جو بچوں کی معصومیت اور کمزوری کو ظاہر کرتا ہے۔ اس علامت کے ذریعے افسانہ اس حقیقت کی نشاندہی کرتا ہے کہ استحصال کا شکار ہونے والے بچے محض جسمانی اذیت سے نہیں گزرتے بلکہ ایک ایسے سماجی ڈھانچے کا حصّہ بن جاتے ہیں جہاں ان کی چیخیں دب جاتی ہیں اور وہ صرف گوشت کے ایک ٹکڑے میں بدل کر رہ جاتے ہیں جس پر طاقتور اپنی مرضی سے قابض ہو جاتے ہیں۔

حمزہ حسن شیخ کے افسانہ "تڑکا" میں ایک معصوم اور یتیم بچے کی کہانی بیان کی گئی ہے جس میں وہ منڈی سے باسی اور بچی کچھی سبزیاں اپنی ماں کو لا کر دیتا ہے جن کو تڑکا لگا کر وہ اپنی گزر بسر کرتے ہیں۔ افسانے میں اس منظر کو یوں قلم بند کیا گیا ہے:

> "غریب لڑکے کا باپ اُس کے بچپن میں ہی وفات پا گیا تھا۔ اب گھر میں، وہ اور اُس کی ماں ہی تھے جہاں اُن کے لیے کوئی بھی کمانے والا نہ تھا۔ زندگی مصائب سے لبریز تھی جو کم ہونے میں نہیں آرہی تھیں۔ اُن کے لیے صرف یہ ایک خوش نصیبی تھی کہ شہر کی سبزی منڈی قریب تھی۔ اس لیے لڑکے کے لیے بہت آسان تھا کہ وہ روز مرہ استعمال کے لیے سبزیاں وہاں سے جمع کر سکے اور بعد میں اسکول جائے"۔(۱۸)

اُس کی زندگی چار دیواروں کے حصار میں بند تھی۔ گھر چلانے کے لیے کوئی ذرائع آمدن نہ تھے مگر جب ایک دن منڈی سے باسی سبزیاں اور پھل اکٹھے کر رہا تھا کہ اچانک دھماکے کی وجہ سے وہ جان کی بازی جاتا ہے۔ اس طرح حمزہ حسن شیخ کا یہ افسانہ ایک اور المیہ کو جنم دیتا ہے۔

افسانہ سماج اور اخلاقیات پر کئی بنیادی سوالات اٹھاتا ہے۔ یہ اس نظام کو بے نقاب کرتا ہے جو طاقت اور خاموشی کے اُصولوں پر قائم ہے جہاں معصومیت کو ایک تجارتی شے سمجھا جاتا ہے۔ اس کہانی میں وہ رویے سامنے آتے ہیں جو استحصال کے شکار بچوں کو نہ صرف تنہا چھوڑ دیتے ہیں بلکہ اکثر ان پر الزام بھی دھر دیتے

ہیں۔ مریم مجید ڈار کا اسلوب اس پہلو کو اس طرح اجاگر کرتا ہے کہ قاری کو اپنی سماجی بے حسی پر بھی سوال اٹھانا پڑتا ہے۔

فنی لحاظ سے افسانہ "چھوٹا گوشت" کا کمال یہ ہے کہ اس میں موضوع کی سنگینی کو جذباتی سطح پر زیادہ واضح کرنے کے بجائے علامتوں کے ذریعے قاری کے ذہن پر ایک دیرپا اثر چھوڑا گیا ہے۔ افسانے میں مکالمے کم اور منظر کشی زیادہ ہے جو قاری کو ہر لمحے کرداروں کی حالت اور فضا کا حصّہ بنا دیتی ہے۔ افسانے کا اختتام بھی کسی روایتی نتیجے پر نہیں ہوتا بلکہ قاری کو ایک بے یقینی کی کیفیت میں چھوڑ دیتا ہے جہاں وہ خود سے سوال کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ آخر یہ مسئلہ کہاں سے پیدا ہوتا ہے اور اس کا حل کہاں ہے؟

یہ افسانہ بچوں کے جنسی استحصال کو صرف ایک جرم کے طور پر نہیں دیکھتا بلکہ اسے ایک نفسیاتی اور سماجی المیے کے طور پر پیش کرتا ہے، جہاں ہر کردار کسی نہ کسی طور پر اس المیے کا حصہ بن جاتا ہے۔ متاثرہ بچہ، سماج کی بے حسی، قانونی نظام کی کمزوری اور مجرم کی ذہنی پیچیدگیاں سب مل کر ایک ایسی حقیقت کو تشکیل دیتے ہیں جسے اکثر نظر انداز کیا جاتا ہے۔

مریم مجید ڈار کا یہ افسانہ جدید اُردو افسانے میں اس لیے بھی اہم ہے کہ یہ ایک ایسے مسئلے پر روشنی ڈالتا ہے جس پر اکثر کھل کر بات نہیں کی جاتی۔ اس کا علامتی اسلوب، گہری سماجی تنقید اور فنکارانہ مہارت اسے ایک منفرد اور یادگار افسانہ بناتے ہیں، جو قاری کو نہ صرف متاثر کرتا ہے بلکہ اسے سوچنے پر بھی مجبور کر دیتا ہے۔

ادب ہمیشہ سے سماجی ڈھانچے پر سوال اٹھانے کا ایک مؤثر ذریعہ رہا ہے۔ یہ محض کہانی سنانے کا فن نہیں بلکہ ایک ایسا آئینہ ہے جس میں معاشرے کی حقیقتیں، اس کی خوبصورتی اور بدصورتی، سب کچھ منعکس ہوتا ہے۔ بچوں کے جنسی استحصال جیسے نازک اور تلخ موضوعات پر لکھا جانے والا ادب دراصل ان اجتماعی رویوں پر سوال اٹھاتا ہے جو اس جرم کو جنم دیتے اور پروان چڑھاتے ہیں۔

سماجی ڈھانچے کی تشکیل میں طاقت، طبقاتی تفریق، روایتی اخلاقیات اور قانونی نظام کا اہم کردار ہوتا ہے۔ جب کسی معاشرے میں طاقتور افراد کمزوروں کا استحصال کرنے لگیں، جب خاموشی کو مصلحت اور جرم کو تقدیر کا حصّہ سمجھ لیا جائے، جب اخلاقیات صرف کمزوروں پر لاگو کی جائیں اور جب قانون انصاف کے بجائے

مصلحتوں میں الجھ جائے، تب ایسے جرائم فروغ پاتے ہیں جو بچوں جیسی معصوم ہستیوں کو سب سے زیادہ متاثر کرتے ہیں۔

اُردو افسانہ نگاری میں اس موضوع کو مختلف انداز میں برتا گیا ہے۔ کچھ کہانیوں میں بچوں کے جنسی استحصال کو حقیقت نگاری کے ذریعے براہِ راست دکھایا گیا، کچھ میں علامتی انداز اپنایا گیا تو کچھ میں اس سماجی المیے کو تجریدی پیرائے میں بیان کیا گیا۔ لیکن ان سب میں ایک بات مشترک ہے: "یہ کہانیاں قاری کو یہ سوچنے پر مجبور کرتی ہیں کہ آیا ہم نے ایسا سماجی ڈھانچہ تشکیل دیا ہے جہاں بچے محفوظ رہ سکیں؟ یا پھر ہمارا نظام طاقتوروں کے مفادات کا محافظ بن چکا ہے"؟ ظفر احمد لکھتے ہیں:

> "ادب صرف الفاظ کا مجموعہ نہیں، بلکہ سماج کے رویوں کا آئینہ ہے۔ ایک ایسا سماج جہاں بچے عدم تحفظ کا شکار ہوں، وہ ترقی کی دوڑ میں پیچھے رہ جاتا ہے۔ یہ معصوم ذہن کل کے معمار ہیں، مگر جب ان کی بنیادی ضروریات ہی پوری نہ ہوں، تو وہ خواب کیسے دیکھیں؟ قوم کے مستقبل کو محفوظ بنانے کے لیے ضروری ہے کہ ہم بچوں کو تحفظ، تعلیم اور ایک بہتر زندگی فراہم کریں، ورنہ اندھیروں میں بھٹکنے والی نسل تیار ہو گی"۔(۱۹)

یہ بھی حقیقت ہے کہ جہاں ادب ان مسائل کو اُجاگر کرتا ہے وہیں قوانین کا وجود بھی ضروری ہے تاکہ اس جرم کے خلاف مؤثر کارروائی کی جاسکے۔ بچوں کے جنسی استحصال کے خلاف عالمی سطح پر کئی قوانین بنائے گئے ہیں اور پاکستان میں بھی اس حوالے سے کچھ پیش رفت ہوئی ہے۔ پاکستان میں "چائلڈ پروٹیکشن اینڈ ویلفیئر ایکٹ" اور "زینب الرٹ، رسپانس اینڈ ریکوری ایکٹ ۲۰۲۰" ایسے قوانین ہیں جو بچوں کے تحفظ کے لیے بنائے گئے ہیں۔ زینب الرٹ ایکٹ خاص طور پر اس حوالے سے بنایا گیا کہ اگر کوئی بچہ لاپتہ ہو یا استحصال کا شکار ہو تو فوری ردِ عمل دیا جائے اور بروقت تحقیقات کی جائیں۔ لیکن ادب ہمیں یہ باور کراتا ہے کہ قوانین کا ہونا کافی نہیں۔ جب تک سماجی رویے تبدیل نہ ہوں، جب تک انصاف کے پیمانے طاقتور اور کمزور کے لیے یکساں نہ ہوں، جب تک جرم کو چھپانے کے بجائے اس کے خلاف آواز بلند نہ کی جائے، تب تک ایسے قوانین بھی محض کاغذوں کی حد تک محدود رہتے ہیں۔ ادب کا سوال یہی ہے کہ ہم نے ایک ایسا سماج کیوں بنالیا ہے

جہاں بچوں کو تحفظ دینے کے بجائے ان کے ساتھ ہونے والے جرائم کو چھپانے اور نظر انداز کرنے کو ترجیح دی جاتی ہے؟

یہ سوال محض کہانیوں میں نہیں بلکہ ہر اس سماجی تعامل میں موجود ہوتا ہے جہاں کمزور کی آواز دبا دی جاتی ہے اور طاقتور کو استثنیٰ دے دیا جاتا ہے۔ یہی وہ بنیادی نقطہ ہے جسے جدید اُردو افسانہ نگار بار بار اٹھاتے ہیں اور قاری کو جھنجھوڑنے کی کوشش کرتے ہیں تاکہ وہ اس حقیقت کا سامنا کرے اور شاید ایک دن یہ معاشرتی بے حسی ختم ہو سکے۔

ادب ہمیشہ سے معاشرتی عکاسی کا سب سے مؤثر ذریعہ رہا ہے۔ یہ محض تفریح یا جمالیات کا وسیلہ نہیں بلکہ ایک ایسی طاقت ہے جو سماج کے پوشیدہ، نظر انداز شدہ اور نازک پہلوؤں کو اجاگر کرتی ہے۔ جدید اُردو افسانہ نگار ان پہلوؤں پر قلم اٹھا رہے ہیں جہاں اصلاح کی ضرورت سب سے زیادہ محسوس کی جاتی ہے۔ خاص طور پر بچوں کے جنسی استحصال جیسے نازک موضوعات پر لکھنا ایک بڑی ذمہ داری ہے جو جدید اُردو افسانہ نگاری میں بخوبی ادا کی جا رہی ہے۔

جدید اُردو افسانہ معاشرتی سچائیوں کی عکاسی کرتا ہے اور وہ تلخ حقائق سامنے لاتا ہے جنھیں عمومی طور پر نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ طاہرہ اقبال، نیلوفر اقبال، نیر عباس علوی، شعیب خالد اور حمزہ حسن عباسی جیسے ادیبوں نے اپنی تحریروں میں اس سماجی المیے کو نہ صرف بیان کیا بلکہ اس کے نفسیاتی اور سماجی محرکات پر بھی روشنی ڈالی۔ مریم مجید ڈار کا افسانہ "چھوٹا گوشت" اس موضوع پر ایک سنجیدہ تخلیق ہے جو علامتی انداز میں لکھا گیا ہے اور اخلاقیات کے ان معیارات پر سوال اٹھاتا ہے جو طاقتور کے لیے کچھ اور، کمزور کے لیے کچھ اور ہوتے ہیں۔ مریم مجید ڈار لکھتی ہیں:

> "وہ اس کی خوبصورتی کو سراہنے لگا اور اپنی موجودگی حق کی طرح جتلانے لگا۔ میری نے پہلی بار ایسا لمس محسوس کیا تھا۔ گھر دیر سے پہنچ کر پنشمنٹ کھائی مگر اج اسے تکلیف کا احساس نہیں ہوا اگلے دن گھبراہٹ اور بکھلاہٹ میں مبتلا رہی ہر اہٹ پر وہی نیلی انکھیں ڈھونڈتی رہی"۔(۲۰)

جدید اُردو افسانے میں حقیقت نگاری، علامت، تجرید اور سماجی ارکیٹائپ جیسے متنوع اسالیب اختیار کیے گئے ہیں۔ بعض افسانے حقیقی واقعات پر مبنی ہوتے ہیں، جن میں کردار اور مکالمے زندگی کی سچائیوں کو اس

انداز میں پیش کرتے ہیں کہ قاری لاشعوری طور پر ان مسائل پر سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ دوسری طرف، بعض افسانے علامتی اور تجریدی انداز میں لکھے گئے ہیں جو ایک وسیع تر منظر نامہ پیش کرتے ہیں اور استحصالی نظام کی جڑوں تک پہنچنے کی کوشش کرتے ہیں۔

بچوں کے جنسی استحصال کے حوالے سے نفسیات میں کئی تھیوریز موجود ہیں جو ظاہر کرتی ہیں کہ یہ جرائم کرنے والے افراد عموماً خود کسی نفسیاتی بیماری یا سماجی جبر کا شکار رہے ہوتے ہیں۔ مثلاً، "سائیکو پیتھی" اور "پیڈوفیلیا" جیسی ذہنی بیماریاں اس جرم سے منسلک کی جاتی ہیں۔ نفسیاتی تجزیہ یہ بھی بتاتا ہے کہ جن معاشروں میں جبر، طاقت کا ناجائز استعمال اور طبقاتی تفاوت زیادہ ہوتا ہے وہاں اس نوعیت کے جرائم بڑھ جاتے ہیں۔ ادب انہی گہرے نفسیاتی اور سماجی عوامل کو سامنے لانے کی کوشش کرتا ہے۔

بچوں کے تحفظ کے حوالے سے قوانین کی موجودگی ضروری ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ معاشرتی رویوں میں تبدیلی بھی ناگزیر ہے۔ پاکستان میں "چائلڈ پروٹیکشن اینڈ ویلفیئر ایکٹ" اور "زینب الرٹ، رسپانس اینڈ ریکوری ایکٹ ۲۰۲۰" جیسے قوانین موجود ہیں مگر ان پر عملدرآمد کی صورتحال اب بھی تسلی بخش نہیں۔ ادب ان قوانین کی عدم فعالیت، سماجی بے حسی اور قانونی پیچیدگیوں پر بھی سوال اٹھاتا ہے۔ شعیب خالد جیسے افسانہ نگاروں نے اپنے افسانوں میں ان سماجی و قانونی مسائل کی نشاندہی کی ہے اور ایسے حالات کی منظر کشی کی ہے جو ایک عام قاری کو اندر سے جھنجھوڑ کر رکھ دیتی ہے۔

ادب کی سب سے بڑی خدمت یہ ہے کہ یہ لوگوں کو ان کے اپنے سماج کی وہ حقیقتیں دکھاتا ہے جو عموماً پس پردہ رہتی ہیں۔ جدید افسانہ نگاری کا رجحان سماج میں موجود ان زخموں پر روشنی ڈال رہا ہے جنھیں اکثر دبا دیا جاتا ہے۔ اگرچہ یہ موضوعات حساس اور تکلیف دہ ہوتے ہیں، لیکن ان پر بات کرنا اور ان پر لکھنا ہی اصلاح کا پہلا قدم ہے۔ عامر نقوی لکھتے ہیں:

> "بچوں کے جنسی استحصال کو روکنے کے لیے حکومت نے مختلف اقدامات کیے ہیں، جن میں سخت قوانین، آگاہی مہمات اور خصوصی ہیلپ لائنز کا قیام شامل ہے۔ بچوں کے تحفظ کے لیے سکولوں میں تربیتی پروگرام متعارف کروائے جا رہے ہیں تاکہ وہ خطرات کو پہچان سکیں اور اپنی حفاظت کر سکیں۔ مگر صرف قانون سازی کافی نہیں، سماج کو بھی اپنا کردار ادا کرنا ہوگا تاکہ معصوم ذہن کسی خوف یا ظلم کا شکار نہ ہوں"۔(۲۱)

یہ کہنا غلط نہ ہو گا کہ ادب اپنی خدمات بخوبی سر انجام دے رہا ہے۔ جدید اُردو افسانہ نگار نہ صرف استحصالی نظام کو بے نقاب کر رہے ہیں بلکہ قاری کے ذہن میں سوالات بھی پیدا کر رہے ہیں۔ جب تک یہ سوالات موجود رہیں گے تب تک اصلاح کی اُمید بھی باقی رہے گی۔ ادب ایک مسلسل عمل ہے جو معاشرے کو جھنجھوڑنے، اسے خود احتسابی کی طرف لے جانے اور ایک بہتر سماج کی تشکیل میں اپنا کردار ادا کرتا رہے گا۔

اُردو ادب میں بچوں کے جنسی استحصال کی مختلف صورتیں مختلف افسانہ نگاروں نے متنوع انداز میں پیش کی ہیں۔ حقیقت نگاری کے تحت ایسے افسانے لکھے گئے جہاں یہ ظلم کھلی آنکھوں سے نظر آتا ہے، کردار کی بے بسی، سماجی جبر اور خاموشی کا استحصال نمایاں ہوتا ہے۔ یہ کہانیاں براہ راست بچوں کے ساتھ ہونے والی زیادتی کو دکھاتی ہیں، جس میں قریبی رشتے داروں، اساتذہ یا طاقتور سماجی عناصر کے ہاتھوں بچوں کی معصومیت پامال ہوتی ہے۔ یہاں کچھ افسانہ نگاروں نے علامتی اور تجریدی اسلوب اختیار کیا جہاں کہانی میں براہِ راست ظلم کو بیان کرنے کے بجائے، ایسی علامات دی جاتی ہیں جو قاری کو حقیقت سمجھنے پر مجبور کرتی ہیں۔ کبھی ایک گڑیا یا پرندہ علامتی طور پر استحصال کی علامت بنتا ہے، تو کبھی کسی کہانی میں ماحول، گھٹن اور قید و بند کی کیفیات ایسے المیوں کی نشان دہی کرتی ہیں جو بچوں کی زندگیوں کو متاثر کرتے ہیں۔

معاشرتی جبر کی عکاسی بھی اُردو افسانے میں ملتی ہے، جہاں غربت، طبقاتی فرق اور بے بسی کے باعث بچے استحصال کا شکار ہوتے ہیں۔ کئی کہانیوں میں دکھایا گیا کہ کمزور طبقے کے بچوں کو نہ صرف جسمانی بلکہ جذباتی اور نفسیاتی طور پر بھی نشانہ بنایا جاتا ہے۔ خاص طور پر وہ بچے جو یتیم ہیں یا گھریلو مسائل کا شکار ہیں، ان کے لیے نہ تو قانونی مدد میسر ہوتی ہے اور نہ ہی سماج ان کے لیے کوئی پناہ گاہ فراہم کرتا ہے۔

خاندانی استحصال ایک اور اہم موضوع ہے جو جدید اُردو افسانے میں سامنے آیا ہے۔ کئی کہانیوں میں یہ دکھایا گیا ہے کہ قریبی رشتہ دار، سوتیلے والدین یا گھریلو ملازمین بچوں کو استحصال کا نشانہ بناتے ہیں لیکن یہ معاملات خاندان کی عزت اور روایات کے نام پر دبا دیے جاتے ہیں۔ ایسے افسانے سماج کی اس دوغلی اخلاقیات پر بھی سوال اٹھاتے ہیں جہاں متاثرہ بچے کو خاموش رہنے پر مجبور کیا جاتا ہے جبکہ مجرم آزاد گھومتے ہیں۔

نفسیاتی استحصال بھی ایک نمایاں پہلو ہے جو اُردو افسانے میں جگہ پاتا ہے۔ بعض کہانیاں ان بچوں کے نفسیاتی المیوں پر روشنی ڈالتی ہیں جو اس ظلم کا شکار ہوتے ہیں۔ وہ خوف، خاموشی اور سماجی بے حسی کا بوجھ لیے زندگی گزارنے پر مجبور ہوتے ہیں اور اکثر پوری زندگی اس صدمے کے اثرات میں رہتے ہیں۔ ایسے افسانے

قاری کو اس زاویے سے سوچنے پر مجبور کرتے ہیں کہ استحصال صرف جسمانی نہیں بلکہ ذہنی اور جذباتی بھی ہوتا ہے جو کسی بچے کی پوری شخصیت اور نفسیات کو تباہ کر سکتا ہے۔ یہ تمام صورتیں اس حقیقت کی نشاندہی کرتی ہیں کہ جدید اُردو افسانہ نگار ان مسائل کو نظر انداز نہیں کر رہے بلکہ اپنے افسانوں کے ذریعے سماجی شعور بیدار کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ یہ ادب محض تفریح کا ذریعہ نہیں بلکہ سماجی مسائل پر سوال اٹھانے اور بہتری کی راہ دکھانے کا ایک موثر وسیلہ ہے۔

محرکات:

۱۔ غربت اور بے روزگاری کے باعث کئی بچے گھروں سے باہر کام کرنے پر مجبور ہوتے ہیں جہاں ان کا استحصال کیا جاتا ہے۔ مالی مشکلات کی وجہ سے والدین بھی اکثر بچوں پر نظر نہیں رکھ پاتے، جو انہیں مزید غیر محفوظ بنا دیتا ہے۔

۲۔ ایسے بچے جو گھروں میں جسمانی یا جذباتی تشدد کا سامنا کرتے ہیں، زیادہ کمزور اور غیر محفوظ ہو جاتے ہیں۔ ان کی نفسیاتی حالت انھیں با آسانی استحصال کا شکار بنا سکتی ہے کیونکہ وہ مدد مانگنے سے ڈرتے ہیں۔

۳۔ اگرچہ بچوں کے تحفظ کے لیے قوانین موجود ہیں مگر ان پر سختی سے عمل نہیں ہوتا۔ متاثرہ بچوں کو انصاف دلانے میں تاخیر، ملزمان کو سخت سزائیں نہ دینا اور نظام کی پیچیدگیاں مجرموں کو مزید بے خوف بنا دیتی ہیں۔

۴۔ بعض افراد ذہنی امراض اور نفسیاتی عوارض جیسے پیڈوفیلیا میں مبتلا ہوتے ہیں جس کے باعث وہ بچوں کی طرف جنسی رغبت محسوس کرتے ہیں۔ اگر ان کا علاج نہ ہو تو وہ اپنے انحرافی رجحانات پر قابو نہیں پا سکتے۔

۵۔ اگر مجرموں کو بار بار جرم کے باوجود سزا نہیں دی جاتی تو وہ مزید بے خوف ہو جاتے ہیں۔ ایسے افراد اکثر متاثرہ بچوں یا ان کے خاندان کو دھمکا کر خاموش کرا دیتے ہیں جس سے ان کے خلاف کاروائی مشکل ہو جاتی ہے۔

۶۔ کئی والدین اپنے بچوں کو ممکنہ خطرات اور ان سے بچنے کے طریقے نہیں سکھاتے جس کی وجہ سے بچے آسانی سے دھوکہ کھا سکتے ہیں۔ انھیں یہ سکھانا ضروری ہے کہ کس طرح کسی بھی مشکوک رویے کی شناخت کریں اور اس پر رد عمل دیں۔

۷۔ بچوں اور نوجوانوں کو انٹرنیٹ پر ایسا مواد مل جاتا ہے جو ان کے ذہن پر منفی اثر ڈالتا ہے۔ ایسے مواد کی تشہیر بچوں کے ساتھ استحصال کرنے والے افراد کے لیے بھی ایک محرک بن سکتی ہے۔

۸۔ والدین اور بچوں کے درمیان تعلق کمزور ہو تو بچے اپنے مسائل کے بارے میں کھل کر بات نہیں کر پاتے۔ اگر گھر میں ان کی بات نہیں سنی جاتی تو وہ باہر سے کسی پر بھروسا کر سکتے ہیں، جو ان کا فائدہ اٹھا سکتا ہے۔ اسکولوں میں بچوں کو جسمانی اور جذباتی حفاظت کے بارے میں زیادہ تعلیم نہیں دی جاتی۔ اگر تعلیمی ادارے اس بارے میں آگاہی دیں، تو بچے خطرناک حالات سے بہتر طریقے سے نمٹ سکتے ہیں۔

۹۔ استحصال کا شکار ہونے والے بچوں کے لیے نفسیاتی مدد، قانونی تحفظ اور بحالی کے مراکز کی کمی ایک بڑا مسئلہ ہے۔ اگر متاثرہ بچوں کو مناسب مدد نہ ملے، تو وہ ذہنی دباؤ کا شکار رہتے ہیں اور ان کی زندگی متاثر ہو سکتی ہے۔

حوالہ جات

۱۔ عزیز احمد، ترقی پسند ادب، نگار شات پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۶ء، ص ۱۱۲

۲۔ ظفر احمد، ادب کے نفسیاتی رویے، ماہ رنگ ادب، کراچی، ۲۰۰۰ء، ص ۸۲

۳۔ شعیب خالق، درجِ ذیل مشمولہ چھتری نما کہانیاں، رومیل ہاؤس آف پبلی کیشنز، راولپنڈی، ۲۰۱۹ء، ص ۳۸

۴۔ ایضاً، ص ۷۰

۵۔ شہزاد احمد، دماغ کی صورت گری، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۹ء، ص ۲۹۸

۶۔ مریم مجید ڈار، سوچ زار، فکشن ہاؤس، لاہور، ۲۰۱۹ء، ص ۵۱

۷۔ سعید اختر، نفسیاتی مطالعہ، کاروان ادب پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۳ء، ص ۲۷۶

۸۔ سلیم اختر، ڈاکٹر، نفسیاتی تنقید، سنگ میل پبلی کشنز، لاہور، ۲۰۰۱ء، ص ۲۶۹

۹۔ شعیب خالق، چھتری نما کہانیاں، ص ۱۴۳،

۱۰۔ مریم مجید ڈار، چھوٹا گوشت، مشمولہ سوچ زار، فکشن ہاؤس، کراچی، ۲۰۱۹ء، ص ۱۰۱

۱۱۔ رؤف احمد ملک، خواتین افسانہ نگار، مشمولہ، ادب رنگ، شمارہ ۱۲، الفقر ہاؤس، لاہور، ۲۰۰۵ء، ص ۲۳۱

۱۲۔ سہیل احمد، ادب کے سماجی رویے، فکر فن پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۶ء، ص ۶۷

۱۳۔ حمزہ حسن شیخ، قیدی، نیشنل بُک فاؤنڈیشن، اسلام آباد، ۲۰۲۵، ص ۵۱

۱۴۔ سہیل احمد، ادب کے سماجی رویے، ص ۱۲۸

۱۵۔ سلیم اختر، ڈاکٹر، نفسیاتی تنقید، سنگ میل پبلی کشنز، لاہور، ۲۰۰۱ء، ص ۲۶۹

۱۶۔ سعید اختر، نفسیاتی مطالعہ، کاروان ادن پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۳ء، ص ۲۷۶

۱۷۔ رؤف احمد ملک، خواتین افسانہ نگار، مشمولہ، ادب رنگ، لاہور، ۲۰۰۵ء، ص ۲۳۳

۱۸۔ حمزہ حسن شیخ، قیدی، ص ۸۷

۱۹۔ ظفر احمد، ادب کے نفسیاتی رویے، ماہ رنگ ادب، کراچی، ۲۰۰۰ء، ص ۸۲

۲۰۔ مریم مجید ڈار، چھوٹا گوشت، مشمولہ سوچ زار، فکشن ہاؤس، کراچی، ۲۰۱۹ء، ص ۱۰۲

۲۱۔ عامر نقوی، سماجیات: نیا تناظر، حصہ اول، مکتبہ دانیال لاہور، ۲۰۰۵ء، ص ۴۳۲

باب پنجم

مجموعی جائزہ

ادب کسی بھی معاشرتی مسئلے کو اجاگر کرنے اور اس پر غور و فکر کی راہیں ہموار کرنے کا ایک موثر ذریعہ ہے۔ اُردو افسانہ اپنی حقیقت نگاری، گہرے سماجی شعور اور نفسیاتی بصیرت کے سبب ہمیشہ سے زندگی کے ان پہلوؤں کو سامنے لاتا رہا ہے جو عمومی طور پر نظر انداز کیے جاتے ہیں۔ استحصالِ حقوقِ اطفال ایسا ہی ایک سنگین سماجی مسئلہ ہے جس پر اُردو افسانے میں بارہا روشنی ڈالی گئی ہے۔

بچوں کے حقوق کا استحصال محض ایک اخلاقی یا قانونی مسئلہ نہیں بلکہ ایک گہرا سماجی المیہ ہے جو فرد کی نفسیات، خاندان کی ساخت اور وسیع تر معاشرتی رویوں پر اثر انداز ہوتا ہے۔ غربت، جہالت، روایتی جبر، سماجی ناانصافی اور غیر مساوی اقتصادی نظام کے باعث لاکھوں بچے اپنے بنیادی حقوق سے محروم رہ جاتے ہیں۔ چائلڈ لیبر، گھریلو تشدد، جسمانی و ذہنی استحصال، جنسی زیادتی، تعلیم سے محرومی، صحت کی سہولیات تک رسائی نہ ہونا اور دیگر مسائل بچوں کے استحصال کی مختلف شکلیں ہیں جو ہمارے معاشرے میں عام ہیں۔

شعیب خالق، حمزہ حسن شیخ اور مریم مجید ارنے اس تلخ حقیقت کو اپنی تحریروں میں سمویا ہے۔ ان کے افسانے محض بیانیہ نہیں بلکہ ایک احتجاج ہیں، ایک ایسی چیخ جو ان معصوم بچوں کے حق میں بلند کی گئی ہے جو بول نہیں سکتے، جو اپنے اوپر ہونے والے ظلم کے بارے میں کچھ کہنے کی طاقت نہیں رکھتے۔ یہ افسانہ نگار ان کی خاموشی کو زبان دیتے ہیں۔ ان کی بے بسی کو بیان میں ڈھالتے ہیں اور ان کے حقوق کی پامالی پر سماج سے سوال کرتے ہیں۔

جدید اُردو افسانہ ان معاملات کو محض ایک المناک کہانی کے طور پر نہیں پیش کرتا بلکہ اس کے گہرے نفسیاتی اور سماجی پہلوؤں کو بھی اجاگر کرتا ہے۔ یہ محض کسی چائلڈ لیبر فیکٹری یا کسی زمیندار کے استحصال زدہ بچے کی کہانی نہیں ہوتی بلکہ اس میں اس پورے نظام پر تنقید کی جاتی ہے جو ایسے مظالم کو پنپنے دیتا ہے۔ یہ افسانے کسی فردِ واحد کے جرم کی نشان دہی نہیں کرتے بلکہ پورے سماجی ڈھانچے پر سوال اٹھاتے ہیں جو بچوں کو ایک بہتر مستقبل دینے میں ناکام رہا ہے۔

جدید اُردو افسانے کے موضوعات اس قدر وسیع ہو چکے ہیں کہ ان میں صرف بچوں کے استحصال جیسے مسائل نہیں بلکہ صنفی نابرابری، گھریلو تشدد، جنگ زدہ علاقوں میں بچوں کی حالتِ زار، مہاجر بچوں کی بے بسی اور نفسیاتی طور پر ٹوٹے ہوئے بچوں کے معاملات بھی جگہ پا رہے ہیں۔ یہ افسانے محض جذباتی سطح پر نہیں لکھے جاتے بلکہ وہ تمام عوامل کو بھی زیر بحث لاتے ہیں جو بچوں کی زندگی پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ غربت اور جہالت کی بات ہو یا روایتی رسوم و رواج کی جکڑ بندی، سماجی ناانصافی کی بات ہو یا ریاستی بے حسی، ہر پہلو کو اس ادب میں جگہ دی جا رہی ہے۔

یہاں پر جدید اُردو افسانے کی ایک اور خاصیت بھی قابلِ ذکر ہے۔ اس کی تکنیکی جدت۔ ماضی میں اُردو افسانہ عمومی طور پر بیانیہ کے انداز میں لکھا جاتا تھا مگر اب اس میں علامتی اور تجریدی طرزِ اظہار کو زیادہ اہمیت دی جا رہی ہے۔ افسانے میں استعارات، علامتیں اور داخلی مکالمے اس طرح شامل کیے جا رہے ہیں کہ کہانی بیک وقت ایک حقیقت پسندانہ تصویر اور ایک گہری فلسفیانہ بحث بن جاتی ہے۔ کرداروں کی نفسیاتی پرتیں کھولی جا رہی ہیں، کہانی میں تجسس اور ابہام کے عناصر کو بڑھایا جا رہا ہے اور قاری کو محض ایک سطحی کہانی پڑھنے کے بجائے ایک گہرے فکری تجربے سے گزارا جا رہا ہے۔

جدید اُردو افسانے کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ یہ قاری کو خاموشی سے ایک ایسی دنیا میں لے جاتا ہے جہاں وہ عام طور پر جانا نہیں چاہتا۔ یہ اسے مجبور کرتا ہے کہ وہ اپنے آس پاس کے ماحول پر نظر ڈالے، ان بچوں کی حالتِ زار کو محسوس کرے جو دن بھر سخت مشقت کے بعد شام کو سو بھی نہیں سکتے، جن کی مسکراہٹیں ان کے چہروں پر جمنے سے پہلے ہی ماند پڑ جاتی ہیں۔ شعیب خالق، حمزہ حسن شیخ اور مریم مجید ار جیسے لکھاریوں نے اس حقیقت کو بڑی مہارت کے ساتھ اپنے افسانوں میں سمویا ہے اور اس بات کو یقینی بنایا ہے کہ یہ کہانیاں صرف کتابوں تک محدود نہ رہیں بلکہ قارئین کے ضمیر کو بھی جھنجھوڑ سکیں۔

یہی وہ ادب ہے جو نہ صرف دل کو چھوتا ہے بلکہ ذہن کو بھی بیدار کرتا ہے۔ یہی وہ کہانیاں ہیں جو ایک عام قاری کو اپنے اندر کی دنیا کو دیکھنے پر مجبور کرتی ہیں۔ یہی وہ افسانے ہیں جو سماج کی زنجیروں کو توڑنے کا حوصلہ دیتے ہیں، جو سوال اٹھاتے ہیں، جو احتجاج کرتے ہیں اور جو بچوں کے استحصال کے خلاف ایک خاموش مگر طاقتور چیخ بن کر ابھرتے ہیں۔

شعیب خالق جدید اُردو افسانے کے ان لکھاریوں میں شمار کیے جاتے ہیں جنھوں نے بچوں کے استحصال کو نہ صرف ایک کہانی کے طور پر بیان کیا بلکہ اسے ایک سماجی حقیقت کے طور پر اُجاگر کیا۔ ان کے افسانے بچوں کے تعلیمی، معاشی اور جنسی استحصال کے مختلف پہلوؤں کو نہایت حساسیت اور حقیقت نگاری کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔ وہ محض ایک مظلوم بچے کی داستان نہیں سناتے بلکہ ایک پورے سماجی نظام کی ناکامی کو آشکار کرتے ہیں۔ ان کے اسلوب کی سب سے نمایاں خصوصیت اس کی ڈرامائی تشکیل ہے جو ان کے افسانوں کو ایک عام بیانیہ کہانی سے بلند کر کے ایک بصری اور جذباتی تجربے میں تبدیل کر دیتی ہے۔

شعیب خالق کا اسلوب حقیقت نگاری اور ڈرامائی تناؤ کا حسین امتزاج ہے۔ وہ کہانی کو سیدھے سادے بیانیے میں پیش کرنے کے بجائے اس میں ایسے عناصر شامل کرتے ہیں جو قاری کو براہ راست کہانی کا حصّہ بنا دیتے ہیں۔ وہ مکالموں اور کرداروں کی نفسیاتی کشمکش سے ایسی فضا بناتے ہیں جو قاری کو خود اس منظر میں موجود محسوس کراتی ہے۔ ان کے افسانے صرف الفاظ کی مدد سے ایک اسٹیج تخلیق کرتے ہیں جس میں کردار ایک زندہ حقیقت بن کر سامنے آتے ہیں اور قاری ان کے دکھ درد کو محسوس کرتا ہے۔

تعلیمی استحصال کے حوالے سے ان کے افسانوں میں وہ بچے نمایاں ہوتے ہیں جو غربت کے سبب تعلیم سے محروم کر دیے جاتے ہیں، یا وہ جو مدرسوں اور سکولوں میں استادوں کے جبر کا شکار ہوتے ہیں۔ ان کے افسانوں میں سکولوں کے سخت گیر ماحول، بچوں پر مسلط کیے گئے بے جا تعلیمی دباؤ اور اساتذہ کی جانب سے کیے جانے والے ظالمانہ سلوک کو نہایت باریکی سے دکھایا گیا ہے۔ بعض افسانوں میں وہ ایسے بچوں کو پیش کرتے ہیں جو تعلیم حاصل کرنے کے خواہشمند تو ہوتے ہیں مگر ان کے والدین انہیں کام پر لگا دیتے ہیں یوں ان کے خواب، خواہشیں اور امکانات سب دم توڑ دیتے ہیں۔

معاشی استحصال پر لکھے گئے افسانوں میں وہ بچوں کو محض ایک استحصالی مزدور کے طور پر نہیں دکھاتے، بلکہ ان کی داخلی دنیا کو بھی کھوجتے ہیں۔ وہ کہانی کو اس مقام پر لے آتے ہیں جہاں قاری یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ آخر ایک معاشرہ کس طرح کسی معصوم بچے کو اس حال تک پہنچنے دیتا ہے کہ وہ زندگی کو صرف ایک مشقت سمجھنے لگتا ہے۔ وہ چائلڈ لیبر کے ساتھ ساتھ ان بچوں کی ذہنی اور جذباتی اذیت پر بھی روشنی ڈالتے ہیں، جو کم عمری میں ہی اپنے حقوق سے محروم ہو کر زندگی کی کٹھنائیوں کا سامنا کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔

جنسی استحصال کا موضوع اُردو افسانے میں ہمیشہ سے ایک نازک اور پیچیدہ مسئلہ رہا ہے جسے بیان کرنے کے لیے بڑی ہمت اور حساسیت کی ضرورت ہوتی ہے۔ شعیب خالق نے اس موضوع کو نہایت ہنر مندی سے برتا ہے۔ ان کے افسانے براہ راست کسی بھی قسم کے سنسنی خیز بیانیے سے گریز کرتے ہیں بلکہ وہ ایک ماحولیاتی تصویر کشی اور داخلی مکالموں کی مدد سے ایک ایسا جذباتی اور نفسیاتی دباؤ پیدا کرتے ہیں جو قاری کو جھنجھوڑ کر رکھ دیتا ہے۔ وہ ان بچوں کی کہانیاں بیان کرتے ہیں جو گھریلو ملازمین کے طور پر کام کرتے ہوئے یا مدارس اور اسکولوں میں ظلم کا شکار ہو جاتے ہیں، مگر کوئی ان کی فریاد نہیں سنتا۔ وہ اس سماج پر سوال اٹھاتے ہیں جو مظلوم بچوں کو خاموش رہنے پر مجبور کرتا ہے اور ان کی اذیت کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیتا ہے۔

ان کے افسانوں میں بچوں کے جذباتی المیے کو نہایت مؤثر انداز میں بیان کیا جاتا ہے۔ وہ ان کہانیوں میں ایک ایسا ڈرامائی رنگ پیدا کرتے ہیں جس میں قاری خود کو کرداروں کے ساتھ جڑا ہوا محسوس کرتا ہے۔ وہ کرداروں کے نفسیاتی تجزیے کو کہانی کا ایک لازمی حصہ بنا کر پیش کرتے ہیں جس سے کہانی صرف ایک واقعہ بیان کرنے کی بجائے ایک مکمل جذباتی اور فکری تجربہ بن جاتی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ بچوں کے استحصال پر صرف افسانے ہی نہیں بلکہ کئی جدید ڈرامے بھی تخلیق کیے جا رہے ہیں جو ان مسائل کو نمایاں کرتے ہیں۔ ان کے افسانے کئی ایسی کہانیوں کا بنیادی حوالہ بنتے ہیں جنہیں اسٹیج یا ٹیلی ویژن پر پیش کیا گیا ہے۔ خاص طور پر بچوں کی نفسیاتی کشمکش کو نمایاں کرنے والے کئی ڈراموں میں حمزہ حسن شیخ کی کہانیوں کی جھلک محسوس کی جا سکتی ہے۔

ان کے افسانے اس بات کا ثبوت ہیں کہ جدید اُردو ادب محض تفریح کا ذریعہ نہیں بلکہ ایک سماجی آئینہ ہے جو ان مسائل کو نمایاں کرتا ہے جنھیں اکثر نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ وہ اپنی کہانیوں کے ذریعے ہمیں یہ سوچنے پر مجبور کرتے ہیں کہ ہم نے ایک ایسے سماج کو جنم دیا ہے جہاں بچے اپنی معصومیت کھو دیتے ہیں، جہاں ان کے خواب معاشی ضرورتوں تلے دب جاتے ہیں اور جہاں ان کی نفسیات ہمیشہ کے لیے زخم خوردہ رہ جاتی ہے۔ ان کے افسانے ہمیں یہ باور کراتے ہیں کہ بچوں کا استحصال محض ایک کہانی کا موضوع نہیں بلکہ ایک اجتماعی المیہ ہے جس کے اثرات نسلوں تک محسوس کیے جاتے ہیں۔

مریم مجید ڈار جدید اُردو افسانے کی ان نمایاں لکھاریوں میں شامل ہیں جنھوں نے بچوں کے استحصال کے موضوع کو نہ صرف نفسیاتی گہرائی کے ساتھ برتا بلکہ اس کے سماجی پہلو کو بھی روشن کیا۔ ان کے افسانے

محض کہانیاں نہیں بلکہ ایک ایسا آئینہ ہیں جو ان تکلیف دہ سچائیوں کو منعکس کرتا ہے جنھیں معاشرہ دیکھنے سے گریز کرتا ہے۔ وہ بچوں کے داخلی کرب، محرومیوں اور خوف کو بیان کرنے کے ساتھ ساتھ اس استحصال کے پس پشت کام کرنے والے سماجی ڈھانچے اور نفسیاتی اثرات کو بھی موضوعِ بحث بناتی ہیں۔

ان کے افسانوں میں نفسیاتی تجزیہ ایک بنیادی عنصر کے طور پر شامل ہوتا ہے۔ وہ یہ دکھاتی ہیں کہ جب ایک بچہ مسلسل استحصال کا شکار رہتا ہے—چاہے وہ گھریلو جبر ہو، تعلیمی دباؤ ہو، یا جنسی استحصال—تو اس کے ذہن میں کیسے پیچیدہ جذباتی اور نفسیاتی ردعمل پیدا ہوتے ہیں۔ وہ بچے جو محبت، تحفظ اور آزادی کے متلاشی ہوتے ہیں، اکثر خوف، عدم تحفظ اور احساسِ کمتری کے بوجھ تلے دب جاتے ہیں۔ ان کے افسانے اس باطنی کشمکش کو نہایت حساس انداز میں اجاگر کرتے ہیں جہاں ایک معصوم بچہ اپنی شناخت کھونے لگتا ہے اور ایک ایسا وجود اختیار کر لیتا ہے جو محض دوسروں کی توقعات کے بوجھ تلے دبا ہوا ہوتا ہے۔

خاص طور پر ان کے افسانوں میں وہ بچے نمایاں ہیں جو گھر اور سماج میں مسلسل دباؤ کا شکار ہوتے ہیں۔ وہ بچے جو اپنے والدین کی سختی، اساتذہ کی بے حسی اور سماج کی بے توجہی کے سبب ایک گہرے خوف میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ یہ خوف محض جسمانی سزا کا نہیں بلکہ اپنی شناخت کھونے، محبت سے محروم ہونے اور خود کو غیر اہم محسوس کرنے کا بھی ہوتا ہے۔ ان کے کردار عام زندگی کے وہ بچے ہیں جو اسکول میں کم نمبروں پر ڈانٹ کھاتے ہیں جو کھیل کود کے بجائے مشقت پر مجبور ہوتے ہیں اور جن کے معصوم خواب حالات کی سختیوں میں دم توڑ دیتے ہیں۔

مریم مجید ڈار کے افسانے صرف انفرادی نفسیات کا مطالعہ نہیں بلکہ ایک وسیع تر سماجی تجزیہ بھی پیش کرتے ہیں۔ وہ اس بات پر روشنی ڈالتی ہیں کہ بچوں کے استحصال کا مسئلہ محض چند افراد کی ظالمانہ فطرت کا نتیجہ نہیں بلکہ ایک ایسے سماجی نظام کا شاخسانہ ہے جو طاقتور اور کمزور کے درمیان ایک وسیع خلیج پیدا کر دیتا ہے۔ ان کے افسانے ان سماجی رویوں کو بے نقاب کرتے ہیں جو بچوں کو بے زبان اور بے بس بنا دیتے ہیں۔

ان کا ایک نمایاں موضوع وہ طبقاتی تقسیم ہے جو بچوں کی زندگیوں کو مختلف راستوں پر ڈال دیتی ہے۔ ایک طرف وہ بچے ہیں جو آسائشوں میں پلتے ہیں، جنھیں بہترین تعلیمی مواقع، ذہنی آزادی اور ہر قسم کا تحفظ حاصل ہوتا ہے اور دوسری طرف وہ بچے ہیں جو کم عمری میں ہی زندگی کی سختیوں سے آشنا ہو جاتے ہیں جن کے لیے تعلیم ایک خواب اور خوشی ایک نایاب چیز بن جاتی ہے۔ ان کے افسانے ان تضادات کو نہایت حساس

انداز میں اُجاگر کرتے ہیں جہاں ایک بچہ اپنی خواہشوں کے ساتھ جیتا ہے جبکہ دوسرا اپنی خواہشوں کو دفن کرنا سیکھتا ہے۔

ان کے افسانوں میں سماج کے مجموعی رویے پر بھی سوال اٹھایا جاتا ہے۔ وہ یہ دکھاتی ہیں کہ بچوں کا استحصال ایک انفرادی جرم نہیں بلکہ ایک اجتماعی غفلت کا نتیجہ ہے۔ ان کے افسانوں میں وہ کردار بار بار ابھرتے ہیں جو اپنی تکلیف کا اظہار کرنا چاہتے ہیں مگر انہیں سننے والا کوئی نہیں ہوتا۔ وہ بچے جو روز ظلم سہتے ہیں مگر ان کے زخموں کو کوئی محسوس نہیں کرتا، ان کے جذبات کو کوئی اہمیت نہیں دیتا اور ان کی کہانیوں کو کوئی تسلیم نہیں کرتا۔

یہی وجہ ہے کہ ان کے افسانے محض کہانیاں نہیں بلکہ ایک احتجاج بھی ہیں۔ وہ ہمیں مجبور کرتے ہیں کہ ہم اپنی اجتماعی بے حسی پر غور کریں، ان زخموں کو دیکھیں جنھیں ہم نظر انداز کرتے آئے ہیں اور ان بچوں کے بارے میں سوچیں جو معاشرتی ناانصافی کی سب سے بڑی قیمت چکا رہے ہیں۔ ان کے افسانے ہمیں یہ احساس دلاتے ہیں کہ بچوں کا استحصال محض ایک فرد کا المیہ نہیں بلکہ پورے سماج کا نقصان ہے، ایک ایسی چوٹ ہے جو صرف ان معصوموں پر نہیں لگتی بلکہ ہماری اجتماعی روح پر بھی نشان چھوڑ جاتی ہے۔

بچوں کے استحصال کا موضوع اُردو افسانے میں ہمیشہ سے موجود رہا ہے مگر جدید اُردو افسانہ اس مسئلے کو ایک نئے زاویے سے دیکھنے اور پیش کرنے کی راہیں کھول رہا ہے۔ جہاں ماضی میں بچوں کے استحصال کو زیادہ تر جذباتی بیانیے اور سادہ طرزِ تحریر میں بیان کیا جاتا تھا، وہیں جدید اُردو افسانہ اس مسئلے کو گہرے نفسیاتی، سماجی اور فلسفیانہ تجزیے کے ساتھ پیش کر رہا ہے۔ اس تناظر میں، بچوں کے تعلیمی، معاشی اور جنسی استحصال کو مختلف جہتوں میں بیان کیا جا رہا ہے، جس سے اُردو افسانے کی فکری اور علمی وسعت میں نمایاں اضافہ ہوا ہے۔

جدید اُردو افسانے میں بچوں کے استحصال کو محض ایک جذباتی یا واقعاتی مسئلے کے طور پر نہیں دیکھا جاتا، بلکہ اسے ایک گہرے سماجی اور نفسیاتی بحران کے طور پر پیش کیا جاتا ہے۔ یہ افسانے نہ صرف انفرادی کرداروں کی کہانیاں سناتے ہیں، بلکہ پورے سماجی ڈھانچے کو چیلنج کرتے ہیں اور ان نظاموں پر سوال اٹھاتے ہیں جو بچوں کو کمزور، بے بس اور استحصال کا شکار بنا دیتے ہیں۔ اس نئے تناظر میں افسانہ نگار بچوں کی معصومیت اور ان کے خوابوں کی تباہی کو محض دکھ اور ہمدردی کی نظر سے نہیں دیکھتے، بلکہ اس کی جڑوں تک پہنچنے کی کوشش کرتے ہیں۔

بچوں کے تعلیمی استحصال کے حوالے سے جدید اُردو افسانہ نہایت حقیقت پسندانہ اور تلخ انداز اختیار کر چکا ہے۔ جہاں ایک طرف بچوں پر تعلیمی دباؤ اور ان کے جذباتی استحصال کو دکھایا جارہا ہے، وہیں دوسری طرف ان بچوں کی حالت کو بھی اُجاگر کیا جارہا ہے جو غربت کی وجہ سے تعلیم سے محروم ہو جاتے ہیں۔ یہ افسانے اس تلخ حقیقت کو واضح کرتے ہیں کہ تعلیم کا حق سب کو حاصل ہونے کے باوجود عملی طور پر یہ صرف چند مخصوص طبقات تک محدود ہے۔ اس موضوع پر لکھی گئی کہانیاں قارئین کو مجبور کرتی ہیں کہ وہ اپنے تعلیمی نظام اور اس میں پائے جانے والے استحصالی عناصر پر غور کریں۔

اسی طرح، بچوں کے معاشی استحصال پر لکھی جانے والی کہانیاں جدید اُردو افسانے میں ایک نئے احساس اور گہرائی کے ساتھ جگہ پارہی ہیں۔ ان افسانوں میں محض چائلڈ لیبر کو نہیں دکھایا جاتا بلکہ اس نفسیاتی تبدیلی کو بھی پیش کیا جاتا ہے جو بچہ کم عمری میں محنت مزدوری کرتے ہوئے محسوس کرتا ہے۔ افسانہ نگاروں نے ان کہانیوں میں دکھایا ہے کہ کیسے ایک بچہ اپنے بچپن کو کھو دیتا ہے، کیسے اس کے خواب وقت سے پہلے دم توڑ دیتے ہیں اور کیسے ایک معصوم ذہن جو کھیل کود اور سیکھنے کے لیے تخلیق ہوا تھا، محض بقا کی جنگ میں الجھ کر رہ جاتا ہے۔

جنسی استحصال کے موضوع پر بھی جدید اُردو افسانہ ایک نہایت حساس مگر بے باک انداز میں لکھا جارہا ہے۔ جہاں پہلے یہ موضوع ممنوع سمجھا جاتا تھا وہیں اب افسانہ نگار بڑی مہارت اور گہرے فکری پس منظر کے ساتھ ان کہانیوں کو بیان کررہے ہیں۔ ان افسانوں میں متاثرہ بچوں کی نفسیاتی الجھنوں، خوف اور صدمے کو اس طرح پیش کیا جارہا ہے کہ قاری نہ صرف ان کرداروں سے جڑنے لگتا ہے بلکہ معاشرتی بے حسی پر بھی سوال اٹھانے لگتا ہے۔

یہ تمام موضوعات جدید اُردو افسانے کو ایک نئی جہت عطا کررہے ہیں جس میں جذباتیت کے بجائے تحقیق، نفسیاتی گہرائی اور سماجی حقیقت نگاری زیادہ نمایاں ہے۔ اس حوالے سے شعیب خالق، حمزہ حسن شیخ اور مریم مجید ڈار جیسے افسانہ نگاروں کا کام خصوصی اہمیت رکھتا ہے جو اس موضوع کو محض ایک مسئلے کے طور پر نہیں بلکہ ایک سماجی، نفسیاتی اور فکری مظہر کے طور پر پیش کررہے ہیں۔ ان کے افسانے نہ صرف اُردو ادب کی فکری ترقی میں اہم کردار ادا کررہے ہیں بلکہ تحقیق کے نئے دروازے بھی کھول رہے ہیں۔

اس موضوع پر ہونے والی تحقیق نہ صرف اُردو افسانے کی تنقید و تجزیہ کے لیے ایک نیا میدان فراہم کرے گی بلکہ سماجی علوم، نفسیات اور انسانی حقوق جیسے شعبوں کے لیے بھی ایک اہم حوالہ بن سکتی ہے۔ بچوں کے استحصال کو محض اخلاقی اور جذباتی مسئلے کے طور پر نہیں بلکہ ایک علمی اور تحقیقی معاملے کے طور پر دیکھنے کا جو رجحان جدید اُردو افسانے میں پیدا ہوا ہے وہ تحقیق و تنقید کی دنیا میں ایک نئے زاویے کی بنیاد رکھ رہا ہے۔ یہ نہ صرف اُردو افسانے کی موجودہ ترقی میں ایک اہم سنگِ میل ثابت ہو رہا ہے بلکہ اس کے مستقبل کے امکانات کو بھی وسعت دے رہا ہے۔

نتائج

معاصر اُردو افسانے اپنے عہد کی سماجی اور تہذیبی حقیقتوں کو نہایت مؤثر انداز میں پیش کرتے ہیں۔ بچوں کے حقوق اور ان کے استحصال کا سلسلہ بہت پرانا ہے جو ان افسانوں میں جدت کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ ادب اور ادیب معاشرے سے نہ صرف ظلم و ناانصافی کو بے نقاب کرتے ہیں بلکہ قاری کے احساس و شعور کو بھی جھنجھوڑتے ہیں۔ ایسے افسانے دراصل معاشرے کے لیے ایک آئینہ ہیں جو ہماری کو سامنے لاتے ہیں۔ مذکورہ تحقیق سے حاصل شدہ نتائج درجِ ذیل ہیں:

۱- معاصر اُردو افسانے بچوں کے استحصال کو نہایت حساسیت اور حقیقت نگاری کے ساتھ پیش کرتے ہیں جس سے معاشرے میں ہونے والی معاشرتی اور سماجی ناانصافیوں کے حوالے سے شعور اُجاگر کیا جاتا ہے۔

۲- ان افسانوں میں بچوں کے استحصال کی وجوہات، جن میں چائلڈ لیبر، بھیک مانگنا، گھریلو غلامی، غربت، معاشی ناہمواری اور بچوں کے حقوق کی پامالی کو سامنے لاتے ہوئے ان کی نفسیاتی ٹوٹ پھوٹ، احساس کمتری اور اس سے پیدا ہونے والے مسائل کو اُجاگر کیا جاتا ہے تاکہ بروقت ان مسائل کا سدِباب کیا جاسکے۔

۳- ایسے افسانوں میں افسانہ نگار حقیقت نگاری کو سامنے لاکر ریاستی قوانین نافذ کرنے والے اداروں اور فلاحی تنظیموں کو معاشرے کی بے حسی اور ناکامی کو سامنے لاتے ہیں تاکہ ایک صحت مند معاشرے کو پروان چڑھایا جاسکے۔

۴- بعض اوقات والدین، سرمایہ دار، آجر، مذہبی اور سماجی حلقے بھی بچوں کے استحصال میں شریک پائے جاتے ہیں۔ افسانہ نگار اپنے افسانوں میں ان کی منافقت کو بھی سامنے لانے کی سعی کرتے ہیں۔

۵- بچوں کے استحصال کے حوالے سے مسائل اُجاگر کرنے پر اگر کوئی قدغن لگائی جاتی ہے تو افسانہ نگار علامت نگاری اور تمثیل نگاری کے ذریعے بچوں کے دکھ درد میں شریک ہوتے ہیں تاکہ ان کے مسائل کا سدِباب کیا جاسکے۔

۶- ترقی پسند تحریک کے حوالے سے حقوق اطفال کے استحصال کو شدت سے اُجاگر کیا جاتا ہے تاکہ اس بنیادی مسئلے کو حل کر کے صحت مند معاشرے کی بنیاد رکھی جاسکے۔ اس تحریک کے زیرِ اثر بعض اوقات احتجاجی رویہ اختیار کرتے ہوئے بھی استحصال کے خلاف آواز بلند کی جاتی ہے۔

۷- افسانہ نگار استحصال اطفال کے حوالے سے معاشرے کے ضمیر کو بیدار کرنے کی کوشش کرتے ہیں تاکہ ان میں اس اہم مسئلے کے حوالے سے احساس ذمہ داری پیدا کیا جاسکے۔ اس لیے کہ یہ مسئلہ ماضی کی طرح آج بھی اتنا ہی اہم ہے لہٰذا اس کی اہمیت سے انکار ممکن نہیں۔

سفارشات

اس مقالے کی تکمیل اور دورانِ تحقیق یہ امر واضح ہوا ہے کہ بچوں کے حقوق کا تحفظ ہر مہذب معاشرے کی بنیادی ذمہ داری ہے، اس حوالے سے ادب ہمیشہ سے سماجی مسائل کے اظہار کا مؤثر وسیلہ رہا ہے۔ زیرِ نظر موضوع "معاصر اُردو افسانے میں استحصالِ حقوقِ اطفال کی پیشکش" کے تناظر میں اُردو افسانے یا ناول میں بچوں کے حقوق اور ان کے استحصال کو سامنے لانے کے لیے درجِ ذیل سفارشات پیش کی جاسکتی ہیں:

۱- اُردو ادب میں بچوں کے استحصال کو تحقیقی افسانے اور ناول کے توسط سے وسیع تحقیقی دائرۂ کار کے ذریعے وسعت دینے کی ضرورت ہے۔

۲- جنسی استحصال، چائلڈ لیبر، گھریلو تشدد، غربت، جنگ، تعلیم سے محرومی، معاشی اور نفسیاتی مسائل کو اخلاقی تناظر میں دیکھا جائے اور ان کے حل کے لیے ٹھوس حکمت عملی اور اقدامات اختیار کیے جائیں۔

۳- معاصر افسانوں میں یہ جانچنے کی کوشش کی جائے کہ ہم ایسے افسانوں کے ذریعے کس حد تک سماجی شعور بیدار کر سکتے ہیں۔ ادب کے ساتھ سماجی رویوں، نفسیات اور قانون کے حوالے سے نتائج اخذ کیے جائیں۔ اس کے لیے سرکاری اور نجی تنظیموں کی مدد سے اعداد و شمار جمع کیے جاسکتے ہیں۔

۴- بچوں کے استحصال پر لکھنے والے مصنفین شعیب خالق، حمزہ حسن شیخ اور مریم مجید ڈار جیسے ادیبوں کی حوصلہ افزائی کرتے ہوئے ان کے افسانوں کو نصاب کا حصّہ بنایا جائے تاکہ بچوں، والدین اور معاشرے میں استحصال اطفال کے حوالے سے شعور اُجاگر کیا جاسکے۔ اس طرح حقوق اطفال کے استحصال پر ہونے والے تحقیقی کام کو معاشرے کے لیے زیادہ سود مند بنایا جاسکتا ہے۔

اُردو افسانے کی تحقیق میں ایسے موضوعات بہت اہم ہیں ان پر تحقیقی کام ہونا بہت ضروری ہے۔

کتابیات

- حمزہ حسن شیخ، قیدی (افسانے)، نیشنل بُک فاؤنڈیشن، اسلام آباد، ۲۰۲۵ء
- اقوام متحدہ کی طرف سے پیش کیا گیا انسانی حقوق کا چارٹر
- آئین پاکستان میں حقوق اطفال کے حوالے سے موجود قوانین
- شعیب خالق، چھتری نما کہانیاں (افسانے) در میل ہاوس آف پبلی کیشنز راولپنڈی ۲۰۱۹ء
- مریم مجید ڈار، سوچ زار (افسانے) فکشن ہاؤس کراچی ۲۰۱۹ء
- اختر علی قریشی، آئین پاکستان ۱۹۷۳ء، ندیم بک ہاؤس لاہور
- اکبر رحمانی، اُردو میں ادب اطفال ایک جائزہ، علم و عرفان پبلکیشن لاہور، ۲۰۰۶ء
- انور سدید، ڈاکٹر، اُردو ادب کی تحریکیں، مجلس ترقی ادب لاہور، ۲۰۱۴ء
- بوردیو، پیئر، "تعلیم، سماج اور ثقافت میں تولید". مترجم: ارشاد حسن، علم و عرفان پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۹ء
- جمیل احمد عدیل، اُردو افسانہ نقش، نگارشات پبلکیشن لاہور، ۲۰۰۰ء
- خالد اقبال، سماجی رویے، ایک مطالعہ، علمی کتاب ہاؤس، لاہور، ۱۹۸۷ء
- ڈاکٹر سلیم آغا قزلباش، اُردو افسانے کے رجحانات، انجمن ترقی ادب لاہور، ۲۰۰۲ء
- رفیع اللہ، بچوں کا ادب اور تنقید کا المیہ، مشمولہ، ماہانہ ادبی لطیف، شمارہ ۷، دسمبر ۲۰۱۴ء
- رؤف احمد ملک، خواتیں افسانہ نگار، مشمولہ، ادب رنگ، شمارہ ۱۲، الفقر ہاؤس، لاہور، ۲۰۰۵ء
- رئیس امروہی، جنسیاتی مطالعے، مکتبہ دانیال لاہور، ۱۹۸۸ء
- سعادت حسن منٹو، سیاہ حاشیے، سنگ میل پبلک کیشن لاہور، ۲۰۰۱ء
- سعید اختر، نفسیاتی مطالعہ، کاروان ادن پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۳ء
- سلیم اختر، ڈاکٹر، نفسیاتی تنقید، سنگ میل پبلی کشنز، لاہور، ۲۰۰۱ء
- سلیم آغا قزلباش، ڈاکٹر، "اُردو کے رجحانات"، کاروان ادب، لاہور، ۲۰۰۱ء

- سہیل احمد، ادب کے سماجی رویے، فکر فن پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۶ء
- شبیر سالک، برصغیر کے معاشی نظریات، الحمدللہ اکیڈمی لاہور، ۱۹۶۷ء
- شہزاد احمد، الفرڈ ایڈلر، سنگ میل پبلی کیشن، لاہور، ۱۹۹۸ء
- شہزاد احمد، دوسرا رخ، بک کارنر کراچی، ۱۹۹۹ء
- شہزاد احمد، "دماغ کی صورت گری"، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۵ء
- شہزاد اقبال شام، ڈاکٹر، دساتیر پاکستان کی اسلامی دفعات ایک تجزیاتی مطالعہ، شریعہ اکیڈمی اسلام آباد، ۲۰۱۸ء
- شیر محمد اختر، سیگمنٹ فرائیڈ ایک مطالعہ، مشمولہ، نظریات، شمارہ نمبر ۲۱، مہران پبلیکیشن، لاہور، ۲۰۰۷ء
- صدیقی، علی محمد، ڈاکٹر، ترقی پسند ادب اور سماجی حقیقت: ایک تجزیہ۔ کراچی: سنگِ میل پبلیکیشنز
- ظفر احمد، ادب کے نفسیاتی رویے، ماہ رنگ ادب، کراچی، ۲۰۰۰ء
- عابد علی عابد، اسلوب، نگارشات پبلکیشن لاہور، ۱۹۹۷ء
- عامر نقوی، سماجیات: نیا تناظر، حصہ اول، مکتبہ دانیال لاہور، ۲۰۰۵ء
- عزیز احمد، ترقی پسند ادب، نگارشات پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۶ء
- علی محمد صدیقی، ترقی پسند ادب، بک پوائنٹ کراچی، ۱۹۹۷ء
- فردوس مرزا، سماجیاتی مطالعے، مشمولہ، فنون، شمارہ ۳۷، کاروان پبلی کیشن، لاہور، ۲۰۰۷ء
- کارل ینگ، شخصیت اور نظریات، مشمولہ، ادب رنگ، نذیر اقبال، فردوس پرنٹنگ پریس لاہور، ۲۰۰۹ء
- گوپی چند نارنگ، بیسویں صدی کا اب، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۲ء
- مارکس، کارل. سرمایہ (Capital: Volume 1). ترجمہ: بین فاوکس (Ben Fowkes). لندن: پینگوئن بکس، ۱۹۷۶، مارکس، سرمایہ (داس کیپیٹل)۔ مترجم: سید محمد حسن۔ لاہور: نیشنل بک فاؤنڈیشن، ۱۹۸۸ء
- محمد ابراہیم، "معاشرتی ناانصافی اور بچوں کا استحصال"، ادب نامہ، شمارہ: جولائی ۲۰۲۳ء، لاہور
- محمد اسحاق، سماجی زاویے، روزمانہ جنگ، سنڈے ایڈیشن، روزنامہ جنگ لاہور، ۲۰۰۹ء

- محمد حنیف، شعیب خالق کے افسانے، مشمولہ، کولاج، نظر اقبال، کولاج، پبلیکیشنز، لاہور، ۲۰۰۹ء
- محمود احمد قاضی، مریم مجید "لفافے کی موت، نالہ دل، بھیر پبلی کیشنز، بھیرہ، ۲۰۱۰ء
- مرزا حامد بیگ، ڈاکٹر، اُردو افسانے کا منظر نامہ، الفیصل پبلشرز، ملتان، ۲۰۰۵ء
- نسرین اکبر، ادب اور سماجیات: تجزیاتی مطالعہ، ادب رنگ پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۶ء
- نیلم احمد بشیر، عہد حاضر کا افسانہ، مشمولہ، صبح بہاراں، بھیرا پبلکیشن، ۲۰۱۷ء
- نئیر عباس، وجودیت: شناخت کا بحران، القرا پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۱ء